

مَدَنی کتب خانہ دہلی، دارالاشیاعہ الراشدین، المہدیہ

ماہنامہ السنۃ

جلد ۱۱

مطبعہ دارالاشیاعہ، دہلی، ۱۹۹۹ء

مجلد

غلام مصطفیٰ ظہیر امن پوری

- کوئی صحیح حدیث قرآن کے مخالف نہیں
- رسول کریم ﷺ سے وفات تک رفع الیدین کا ثبوت
- آٹھ تراویح ہی سنت ہے
- صحیح بخاری کا مطالعہ اور فقہ انکار حدیث
- بوڑھے آدمی کا روزہ
- حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت کا روزہ
- میت کی طرف سے روزوں کی قضائی
- کیا غسل حیض سے پہلے جماعت جائز ہے
- فطرات

دارالتخصص والتحقیق، ممبئی، پاکستان

www.AhleSunnatPk.com



اہل سنت کون؟ حافظ ابوبیکر نورپوری

امام تھوالم السنۃ اسماعیل بن محمد الاصہبانی رحمۃ اللہ علیہ (م ۵۳۵ھ) اہل سنت کا عقیدہ یوں بیان کرتے ہیں:

”اہل سنت یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اکیلا ہے، نہ اس کا کوئی شریک ہے اور نہ کوئی ہم سر، وہ ہمیشہ سے اچھی اچھی صفات سے متصف ہے، وہ صفت سمع کے ساتھ سمیع، صفت بصر کے ساتھ بصیر، صفت علم کے ساتھ علیم اور صفت کلام کے ساتھ متکلم ہے، قرآن کریم اس کا کلام ہے، وہ پڑھے جانے، لکھے جانے، یاد کیے جانے اور سنے جانے، کسی بھی اعتبار سے مخلوق نہیں، خواہ اس کی کوئی بھی صفت لائی گئی ہو اور کسی بھی چیز کی طرف اس کی اضافت کی گئی ہو۔ اللہ تعالیٰ عرش پر مستوی ہے، جیسا کہ خود اس کا فرمان ہے: ﴿الرَّحْمَنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰی﴾ (طہ: ۵) ”رحمان عرش پر مستوی ہے۔“

وہ (اللہ تعالیٰ) ہر رات آسمان دنیا کی طرف نزول فرماتا ہے، جیسا کہ حدیث نبوی (صحیح بخاری: ۷۴۹۴، صحیح مسلم: ۷۵۸) میں آیا ہے، اس کی بہت سی (اچھی اچھی) صفات ہیں، جیسا کہ قرآن کریم اور صحیح احادیث میں موجود ہیں، مثلاً چہرہ، جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ ہے: ﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهُ﴾ (القصص: ۸۸) ”ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے، سوائے اس (اللہ تعالیٰ) کے چہرے کے۔“

نیز فرمایا: ﴿وَيُنْفِیْ وَجْهَ رَبِّکَ﴾ (الرحمن: ۲۷) ”اور تیرے رب کا چہرہ باقی رہے گا۔“

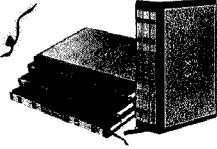
دو حدیثوں (صحیح بخاری: ۷۲۶۰ وغیرہ) میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں: اَعُوذُ بِوَجْهِکَ ... ”(اے اللہ!) میں تیرے چہرے کی پناہ پکڑتا ہوں۔۔۔“ جس نے اللہ تعالیٰ کے چہرے کو مخلوقات کے چہرے سے تشبیہ دی، وہ گمراہ و کافر ہو گیا اور جس نے اللہ تعالیٰ کے چہرے کا انکار کر دیا، وہ بھی انکاری و کافر بن گیا، اللہ تعالیٰ کے دو ہاتھ بھی ہیں، جیسا کہ اس نے خود فرمایا ہے: ﴿لَمَّا خَلَقْتُ بَیْدَیْ﴾ (ص: ۷۵) ”جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے پیدا کیا ہے۔“

نیز فرمایا: ﴿بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ﴾ (المائدہ: ۶۴) ”بلکہ اس کے دونوں ہاتھ فراخ ہیں۔“ حدیث نبوی میں ہے: ”وخلق آدم بیدبہ۔“ اور اس (اللہ تعالیٰ) نے آدم (علیہ السلام) کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پیدا کیا۔“ (یہ حدیث ضعیف ہے)

نیز فرمان نبوی ہے: ”وکلنا یدبہ یمین۔“ اور اللہ کے دونوں ہاتھ دائیں ہیں۔“ (صحیح مسلم: ۱۸۲۷)

اسی طرح وہ صفات باری تعالیٰ جو (صحیح) احادیث میں آئی ہیں، مثلاً تھیلی، قدم، انگلی وغیرہ کا تخیل و تصور میں کوئی صورت لائے بغیر اسی انداز سے اقرار کرنا واجب ہے جس انداز سے حدیث میں وہ بیان ہوئی ہیں، اللہ تعالیٰ رحمت، غضب، ارادہ، مشیت وغیرہ صفات سے بھی متصف ہے، اطاعات میں اس کا ارادہ اور رضادونوں چیزیں ہوتی ہیں، جبکہ معاصی میں اس کا ارادہ تو ہوتا ہے، لیکن رضا نہیں ہوتی، اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے خالق و رازق کے نام سے مسمیٰ ہے، لیکن یہ عقیدہ نہیں رکھا جائے گا کہ خلق و رزق ازل میں تھے، (یہ عقیدہ بھی رکھا جائے گا کہ) محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق میں سے بہترین ہیں، اللہ نے آپ ﷺ کو بشیر و نذیر بنا کر مبعوث فرمایا ہے، آپ ﷺ کے تمام اقوال و افعال ہمارے لیے دلیل و حجت ہیں، وہ (اہل سنت) اعتقاد رکھتے ہیں کہ جنت اور جہنم دونوں ہمیشہ رہنے کے لیے پیدا کی گئی ہیں، دونوں کبھی فنا نہ ہوں گی۔

تمام مومن (روز قیامت) اللہ تعالیٰ کو بغیر پردے کے دیکھیں گے، اللہ ان سے بغیر ترجمان کے کلام فرمائے گا، وہ (اہل سنت) اللہ تعالیٰ کے فرشتوں، کتابوں، رسولوں، اچھی بُری تقدیر، قبر کے سوال، شفاعت، حوض کوثر، میزان، جہنم پر رکھے گئے پل صراط اور ساری مخلوق کے اس پر سے گزرنے پر ایمان لاتے ہیں، (اہل سنت یہ بھی یقین رکھتے ہیں کہ) جو بھی گناہ گار مومن جہنم میں داخل ہوگا، اگر اس کی موت ایمان پر ہوئی ہوگی تو اسے جہنم سے نکال دیا جائے گا۔“ (الحجۃ فی بیان المَحَبَّة: ۴۳۷-۴۳۵)



دین اسلام کی بنیاد عقیدہ توحید اور عقیدہ رسالت پر استوار ہے، یہ شریعتِ مطہرہ کے دو اساسی اور بنیادی اصول ہیں، ان کا ماخذ و مصدر قرآن و حدیث ہے، اہل اسلام کا اجتماعی اور اتفاقی عقیدہ ہے کہ قرآن و حدیث دونوں وحی اور دین الہی ہیں، نیز دونوں اللہ تعالیٰ کی حفاظت سے محفوظ ہیں۔

قرآن مجید : قرآن مجید کلام رب العالمین ہے، اس کے وحی ہونے میں کوئی شبہ نہیں، یہ ہر قسم کے ریب و شک سے پاک و منزہ کتابِ مبین ہے، اس کے باوجود ظالموں نے اس کا انکار کیا ہے، اس انکار کو خود قرآن کریم ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

﴿إِنْ هَذَا إِلَّا سِحْرٌ يُؤْتَرُ ۖ إِنْ هَذَا إِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ۖ﴾ (المذثر: ۲۴-۲۵)

”یہ تو بس ایک موثر جادو ہے، یہ تو کسی بشر کی کلام ہے“

ایک دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿إِنْ هَذَا إِلَّا اخْتِلَافٌ ۖ﴾ (ص: ۷)

”یہ تو محض اپنی طرف سے گھڑی گئی بات ہے۔“

قارئین کرام! انصاف سے بتائیں کہ ان مشرکوں اور کافروں کی بیزاری سے قرآن مجید میں کیا نقص واقع ہوا؟ عیسائی مشنریوں اور آریوں نے تو قرآن مجید میں شکوک و شبہات پیدا کیے ہیں اور اس میں اعتراضات بھی وارد کیے ہیں، قادیانیوں نے قرآن مجید کو منسوخ کہا ہے، حدیثوں کا انکار کیا، شیعہ نے اس میں تواتر کی حد تک تحریف اور کمی و بیشی کا دعویٰ کیا ہے، وہ تو کہتے ہیں کہ اصلی قرآن سترہ ہزار آیات پر مشتمل ہے، کیا اس سارے پراپیگنڈے کی وجہ سے مسلمان قرآن مجید کا انکار کر دیں، جو جواب قرآن کے بارے میں ہوگا، وہی جواب حدیث کے بارے میں ہو جائے گا۔

قرآن مجید اور انکار حدیث :

ہر منکر حدیث درحقیقت منکر قرآن ہوتا ہے، منکرین قرآن اور منکرین حدیث دونوں کے مقاصد ایک ہیں کہ عقیدہ توحید اور عقیدہ رسالت کا انکار کیا جائے، یہ قرآن و حدیث کے انکار سے ہی ممکن ہے، قرآن کی آڑ میں حدیث کو نشانہ بنایا جائے، حدیث پر اعتراضات وارد کیے جائیں، اس میں شکوک و شبہات پیدا کیے

جائیں، حدیث کو تاریخی حیثیت دے کر اسوۂ رسول ﷺ کے خاتمہ کی سازش کی جائے، حدیث کو عجمی شائز قرار دے کر سرے سے انکار ہی کر دیا جائے، دین کی پیروی کی بجائے خواہشات کی پیروی کو ہوا دی جائے، وہ یوں کہ حدیث کو قرآن پر پیش کریں، اگر یہ بزعم خویش قرآن کے موافق ہے تو حدیث ہے، ورنہ جھوٹی داستان! کبھی یہ راگ الاپا کہ قرآن قطعی ہے اور حدیث ظنی ہے، لہذا اس سے عقیدہ توحید اور عقیدہ رسالت ثابت نہیں ہو سکتا، کبھی احادیث صحیحہ اور ائمہ کی متفقہ تصریحات کے خلاف قرآنی نصوص میں باطل تاویلات کر کے ان کو خواہشات کا تختہ مشق بنا دیا، کبھی یہ شور مچایا کہ حدیث تو دو سو سال بعد لکھی گئی ہے، اس پر کیا اعتبار؟ کبھی حدیث کو عقل سقیم کی بھینٹ چڑھا کر اس کا انکار کر دیا۔

خوب یاد رہے کہ ہر باطل مذہب کی یہی پہچان ہے کہ وہ دین کو صرف عقل کی کسوٹی پر پرکھتا ہے، الغرض ہر بد بخت اور ظالم نے دل کھول کر حدیث رسول ﷺ پر ظلم ڈھایا ہے، ہم اپنے اللہ سے شکایت کرتے ہیں، وہی ان ظالموں کو پوچھے گا۔

باطل فرقے اور انکار قرآن و حدیث:

جہمی فرقہ نے جہاں حدیث کا رد کیا، وہاں قرآن کے کلام الہی ہونے کا بھی انکار کیا، معتزلہ فرقہ نے جہاں حدیثیں رد کیں، وہاں قرآن کو بھی مخلوق کہا۔

امام نعیم بن حماد الخزازی رحمہ اللہ (م ۲۲۸ھ) فرماتے ہیں:

المعتزلة تردون ألفی حدیث من حدیث النبی صلی اللہ علیہ وسلم أو نحو ألفی حدیث .
 ”معتزلہ احادیث نبویہ میں سے دو ہزار یا اس کے لگ بھگ احادیث کا انکار کرتے ہیں۔“

(سنن ابی داؤد، تحت حدیث: ۴۷۷۲، وسندہ صحیح)

اشعری فرقہ نے جہاں احادیث نبویہ کو چھوڑا، وہاں قرآن کریم کے اللہ تعالیٰ کی حقیقی کلام ہونے کا انکار کر دیا، خارجیوں نے جہاں احادیث نبویہ کا انکار کیا، وہاں قرآن مجید کی واضح نصوص میں معنوی تحریف اور تاویل باطل کے مرتکب ہوئے، کلابیہ فرقہ نے جہاں احادیث صحیحہ کو خواہشات کا تختہ مشق بنایا، وہاں قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ کا مجازی کلام قرار دیا، مرجی فرقہ نے جہاں بعض احادیث کا رد کیا، وہاں قرآن مجید کی بعض آیات بینات کو مہمل سمجھ لیا، رافضیوں نے جہاں احادیث کا انکار کیا، وہاں قرآن کے محرف و مبدل ہونے کا دعویٰ کر دیا، قادیانیوں نے جہاں احادیث کا انکار کیا، وہاں قرآن کو منسوخ قرار دیا۔

معلوم ہوا کہ ہر گمراہ فرقہ جو حدیث پر ظلم ڈھاتا ہے، وہ ضرور بالضرور قرآن مجید کو اپنی خواہشات کے حوالے کر دیتا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ رنگ و روپ مختلف ہے، کردار ایک ہی ہے۔

انکار قرآن و حدیث کا ایک نقصان :

منکرین قرآن نے نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ باصفات کو تنقید کا نشانہ بنایا، منکرین حدیث رافضیوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی کردار کشی کی، بعض نے جبریل امین سے دشمنی کر لی، منکرین حدیث خارجیوں نے صحابہ کرام کی شان میں تنقیص کی، ناصبی منکرین حدیث نے اہل بیت کی ذاتِ باصفات کو تنقید کا نشانہ بنایا، ہمارے دور کے منکرین حدیث نے ثقہ ائمہ محدثین سلف صالحین اور ثقہ فقہاء و مجتہدین کی تذلیل و توہین کی کوشش کی، محدثین کرام کو جاہل، کم فہم اور قرآن کا دشمن و مخالف قرار دیا۔

اگر نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے وجود مقدس اور محدثین کرام رضی اللہ عنہم کے وجود مبارک کو تنقید کا نشانہ بنایا جائے تو دین اسلام کا وجود مسعود باقی نہیں رہ سکتا، منکرین حدیث بھی یہی چاہتے ہیں کہ دین اسلام کا نام و نشان تک نہ رہے (العیاذ باللہ!)، اس لیے وہ ان نفوسِ مقدسہ کو حدفِ تنقید بناتے ہیں۔

کیا حدیث کی حیثیت تاریخی ہے ؟

کس قدر نا انصافی کی بات ہے کہ حدیثِ رسول ﷺ کو تاریخی حیثیت دے کر دین کے بڑے حصے سے دستبردار ہو جایا جائے؟ جبکہ حدیث کے وحی ہونے پر اجماعِ مسلمین ہے، قرآنی دلائل اس پر شاہد ہیں۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا﴾ (الاحزاب: ۲۱)

”بلاشبہ جو آدمی اللہ (پر ایمان لاتا ہے) اور یومِ آخرت کی امید رکھتا اور اللہ کا زیادہ ذکر کرتا ہے، اس کے لیے رسول اللہ کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔“

رسول اللہ ﷺ کا نمونہ کیا ہے؟ وہ حدیث ہی تو ہے، اگر حدیث کی حیثیت غیر تشریفی اور تاریخی ہے تو اسوۂ رسول ﷺ کہاں ہے؟ منکرین حدیث کا مقصد بھی یہی ہے کہ اسوۂ رسول ﷺ کا خاتمہ ہو جائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہر منکر حدیث قرآن دشمنی کے درپے ہے، یہ ایسے طریقے سے حدیث کی تردید و تکذیب کرتے ہیں، جس سے قرآن کی تردید و تکذیب لازم آتی ہے، اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اللہ رب العزت

نے اپنی عبادت کا حکم تو دیا، لیکن اس کا طریقہ ادائیگی تاریخ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ﴾ (النحل: ۴۴)

”اور ہم نے یہ ذکر (قرآن) آپ پر اس لیے نازل کیا ہے کہ آپ لوگوں کے لیے ان کی طرف نازل شدہ وحی کی تفسیر و تشریح کر دیں۔“

کیا نبی اکرم ﷺ نے قرآن کریم کا بیان پیش کیا ہے؟ اس کی تمبین و توضیح فرمائی ہے؟ اس کی تفسیر و تشریح کی ہے؟ اگر جواب ہاں میں ہے تو وہ کہاں ہے؟ اگر حدیث کی تشریحی حیثیت کا انکار کر دیا جائے تو قرآن مجید کی اس آیت کریمہ کی تکذیب لازم آئے گی، بھلا یہ کہنا کہاں تک صحیح ہوگا کہ ”حدیث کی حیثیت دینی نہیں، محض تاریخی ہے، جو صبح سے شام تک تبدیل ہو کر کچھ سے کچھ ہو جایا کرتی ہے۔“

بھلا سوچیں کہ حدیث کیسی تاریخ ہے جو پوری انسانیت کے لیے سامانِ ہدایت و اصلاح مہیا کرتی ہے اور اصلاح و فلاح کے حوالے سے زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہے؟ یہ کیسی تاریخ ہے جو معیشت و سیاست اور ادب و اخلاق کے دائمی ضابطوں سے مالا مال ہے؟ یہ کیسی تاریخ ہے جو فصاحت و بلاغت، اسلوب و احکام کی بلندی اور دقتِ تعبیر سے لبریز ہے؟ یہ کیسی تاریخ ہے جو حلال و حرام اور طیب و خبیث میں فرق کرتی ہے؟

یہ کیسی تاریخ ہے جو قرآن کی تصدیق کرتی ہے، اس کو وحی برحق قرار دیتی ہے، اس پر عمل کرنے کو کہتی ہے، اس میں اختلاف کرنے سے منع کرتی ہے، اس کی فضیلت بیان کرتی ہے، اس کا معجزہ خالدہ ہونا تسلیم کرتی ہے اور قرآن کریم نے جو تمام اساسی عقائد و عبادات و اخلاق بیان کیے ہیں، ان سے سرمو انحراف نہیں کرتی؟

یہ کیسی تاریخ ہے جو نماز کے طریقہ ادائیگی کی تفصیل بیان کرتی ہے، نیز یہ یہاں تک بتاتی ہے کہ ہوا خارج ہو جانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے؟ یہ کیسی تاریخ ہے جو رشتوں کی حرمت بیان کرتی ہے؟ یہ کیسی تاریخ ہے کہ اس کی ایک بات کے خلاف بھی مسلمانوں کا اجماع نہ ہو سکا؟ یہ کیسی تاریخ ہے کہ عقل سلیم اور فطرت سلیمہ اس کی ہر بات کو تسلیم کرتی ہے؟ یہ کیسی تاریخ ہے کہ اس سے پہلے دنیا کی تاریخ ایسی مثال پیش کرنے سے قاصر رہی ہے؟ اور یہ کیسی تاریخ ہے جو کلمہ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کا ثبوت فراہم کرتی ہے؟؟؟



رسول کریم ﷺ سے وفات تک رفع الیدین کا ثبوت

رسول اللہ ﷺ نماز شروع کرتے وقت، رکوع جاتے اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت اور دو رکعتوں سے اٹھ کر رفع الیدین کرتے تھے، اس کا ترک ثابت نہیں، دلائل ملاحظہ ہوں:

دلیل نمبر ①: سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ حَذْوَ مَنْكِبَيْهِ إِذَا افْتَتَحَ الصَّلَاةَ ، وَإِذَا كَبَّرَ لِلرَّكْعَةِ ، وَإِذَا رَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ الرُّكُوعِ رَفْعَهُمَا كَذَلِكَ أَيْضًا وَقَالَ : سَمِعَ اللَّهُ لِمَنْ حَمَدَهُ ، رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ ، وَكَانَ لَا يَفْعَلُ ذَلِكَ فِي السَّجُودِ .

”بے شک رسول اللہ ﷺ جب نماز شروع کرتے تو کندھوں کے برابر دونوں ہاتھ اٹھاتے، جب رکوع کے لیے اللہ اکبر کہتے اور جس وقت رکوع سے سر اٹھاتے تو اسی طرح رفع الیدین کرتے تھے اور سَمِعَ اللَّهُ لِمَنْ حَمَدَهُ ، رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ کہتے، سجدوں کے درمیان رفع الیدین نہیں کرتے تھے۔“

(صحیح بخاری: ۱۰۲۸/ح: ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۸، صحیح مسلم: ۱۶۸/ح: ۳۹۰)

راوی حدیث کا عمل: سلیمان الشیبانی کہتے ہیں: رأیت سالم بن

عبد اللہ إذا افتتح الصلوة رفع يديه ، فلما ركع رفع يديه ، فلما رفع رأسه رفع يديه ، فسألته ، فقال : رأيت أبي يفعله ، فقال : رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم يفعله .

”میں نے سالم بن عبد اللہ بن عمر تابعی رضی اللہ عنہما کو دیکھا کہ انہوں نے جب نماز شروع کی تو رفع الیدین کیا، جب رکوع کیا تو رفع الیدین کیا اور جب رکوع سے سر اٹھایا تو رفع الیدین کیا، میں نے آپ سے اس بارے میں دریافت کیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا، میں نے اپنے باپ (سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما) کو ایسا کرتے دیکھا ہے، انہوں نے فرمایا تھا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ایسا کرتے دیکھا تھا۔“ (حدیث السراج: ۳۵۳۶/ح: ۱۱۵، وسندہ صحیح)

سبحان اللہ! کتنی پیاری دلیل ہے کہ رسول اللہ ﷺ تا وفات رفع الیدین کرتے رہے، راوی حدیث سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ ﷺ کا رفع الیدین ملاحظہ فرمایا، خود بھی رفع الیدین کیا، یہاں تک ان کے بیٹے سالم جو تابعی ہیں، وہ آپ کا رفع الیدین ملاحظہ کر رہے ہیں اور وہ خود بھی رفع الیدین کر رہے

ہیں، اگر رفع الیدین منسوخ ہو گیا تھا تو نبی کریم ﷺ کی امامت میں نمازیں ادا کرنے والے راوی حدیث صحابی رسول سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو اس نسخ کا علم کیسے نہ ہوا اور سینکڑوں سالوں بعد احناف کو کیسے ہو گیا؟
جناب رشید احمد گنگوہی دیوبندی لکھتے ہیں: ”جو سنت کی محبت سے بلا شر و فساد آئین بالجہر اور رفع

الیدین کرے، اس کو برا نہیں جانتا۔“ (تذکرۃ الرشید: ۱۷۵/۴)

اے اللہ! اے زمین و آسمان کو پیدا کرنے والے تو جانتا ہے کہ ہم رفع الیدین اور آئین بالجہر محض تیرے حبیب محمد رسول اللہ ﷺ کی سنت سے محبت کی وجہ سے کرتے ہیں!

دلیل نمبر ۲: سیدنا مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں بیس دن رہے، جب واپس جانے لگے تو نبی کریم ﷺ نے ان کو حکم دیا: صَلُّوا کَمَا رَأَيْتُمُونِیْ اَصْلَیْ .

”نماز ایسے پڑھو، جیسے تم نے مجھے پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔“ (صحیح بخاری: ۸۸۸/۱ ح: ۶۳۱)

راوی حدیث کا عمل: ابو قلابہ تابعی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

اَنَّهُ رَأَى مَالکَ بْنَ حُوَیْرِثٍ اِذَا صَلَّی کَبَّرَ وَرَفَعَ یَدَیْهِ ، وَاِذَا اَرَادَ اَنْ یَّرْکُعَ رَفَعَ یَدَیْهِ ، وَاِذَا رَفَعَ رَاسَهُ مِنَ الرَّکْعَةِ رَفَعَ یَدَیْهِ ، وَحَدَّثَ اَنْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمْ صَنَعَ هَکْذَا .

”انہوں نے سیدنا مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا، جب آپ نماز پڑھتے تو اللہ اکبر کہتے اور رفع الیدین کرتے، جب رکوع کو جاتے اور جب رکوع سے سر اٹھاتے تو رفع الیدین کرتے اور بیان کرتے کہ رسول اللہ ﷺ ایسا ہی کیا کرتے تھے۔“

(صحیح بخاری: ۱۰۲/۱ ح: ۷۳۷، صحیح مسلم: ۱۶۸/۱ ح: ۳۹۱)

صحابی رسول سیدنا مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد آپ کے حکم کے مطابق رفع الیدین کرتے ہیں اور بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کا بھی یہی عمل مبارک تھا، ثابت ہوا کہ نبی اکرم ﷺ تا وفات رفع الیدین کرتے رہے۔

دلیل نمبر ۳: سیدنا وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو

دیکھا کہ جب نماز میں داخل ہوئے تو رفع الیدین کیا اور اللہ اکبر کہا، پھر کپڑا لپیٹ لیا، دایاں ہاتھ مبارک بائیں ہاتھ مبارک پر رکھا، جب رکوع کا ارادہ کیا تو اپنے دونوں ہاتھ کپڑے سے نکالے، پھر رفع الیدین کیا اور اللہ اکبر کہا، جب (رکوع کے بعد) سمع اللہ لمن حمدہ کہا تو رفع الیدین کیا، سجدہ دونوں ہتھیلیوں کے

درمیان کیا۔“ (صحیح مسلم: ۱۷۳/۱، ح: ۴۰۱)

واضح رہے کہ سیدنا وائل بن حجر رضی اللہ عنہ ۹ ہجری میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔

(عمدة القاری از عینی حنفی: ۲۷۴/۵)

ایک وقت کے بعد موسم سرما میں دوبارہ آئے اور رفع الیدین کا مشاہدہ کیا۔ (سنن ابی داؤد: ۷۲۷، وسندہ حسن)

دلیل نمبر ۴: سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب فرض

نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ کندھوں کے برابر اٹھاتے اور اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم قراءت مکمل کر کے رکوع کا ارادہ کرتے تو رفع الیدین کرتے اور رکوع سے سر اٹھا کر بھی رفع الیدین کرتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں بیٹھے ہوئے رفع الیدین نہیں کرتے تھے، دو رکعتوں سے اٹھ کر بھی رفع الیدین کرتے اور اللہ اکبر کہتے تھے۔“ (سنن ابی داؤد: ۷۴۴، سنن الترمذی: ۳۴۲۳، مسند الامام احمد: ۹۳/۱، وسندہ حسن)

اس حدیث کو امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے ”حسن صحیح“ کہا ہے، امام ابن خزمیہ رحمۃ اللہ علیہ (۵۸۳) نے اسے ”صحیح“ کہا ہے۔

راوی حدیث سلیمان بن داؤد الہاشمی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: **هذا عندنا مثل حديث الزهري عن سالم عن أبيه .** ”ہمارے نزدیک یہ اس طرح کی حدیث ہے جسے امام زہری سالم سے اور وہ اپنے باپ سیدنا عبداللہ بن عمر سے روایت کرتے ہیں۔“ (سنن الترمذی: ۳۴۲۳، وسندہ صحیح)

اس کے راوی عبدالرحمن بن ابی الزناد جمہور کے نزدیک ”ثقة“ ہیں، جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: **وهو ثقة عند الجمهور ، وتكلم فيه بعضهم بما لا يقدح فيه .**

”وہ جمہور کے نزدیک ثقة ہیں، ان پر بعض نے ایسی کلام کی ہے جو موجب جرح نہیں۔“

(نتائج الافکار لابن حجر: ۳۰۴)

مدینہ میں اس کی حدیث ”صحیح“ اور عراق میں ”مضطرب“ تھی، اس پر جرح اسی صورت پر محمول ہے، یہ روایت مدنی ہے۔ **والحمد لله !**

دلیل نمبر ۵: ابوالزبیر کہتے ہیں: **ان جابر بن عبد الله كان اذا افتتح**

الصلاة رفع يديه ، واذا ركع ، واذا رفع رأسه من الركوع فعل مثل ذلك ، ويقول : رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم فعل مثل ذلك .

”سیدنا جابر بن عبد اللہ انصاری رضی اللہ عنہ جب نماز شروع کرتے تو رفع الیدین کرتے، جب رکوع کرتے اور رکوع سے سر اٹھاتے تو اسی طرح رفع الیدین کرتے اور کہتے تھے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے۔ (سنن ابن ماجہ: ۸۶۸، وسندہ صحیح)

ابوالزہر محمد بن مسلم بن تدرس تابعی نے ”مسند السراج“ (۹۲) میں سماع کی تصریح کر رکھی ہے۔
اب غور فرائیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ایک تابعی سیدنا جابر صحابی رسول کو رفع الیدین کرتے دیکھ رہے ہیں اور صحابی رسول اسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل مبارک بتا رہے ہیں، اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے چھوڑ دیا تھا تو صحابہ کرام آپ کی وفات کے بعد اس پر کاربند کیوں رہے؟
دلیل نمبر ۶ : سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

هل أرىكم صلاة رسول الله صلى الله عليه وسلم؟ فكبر ورفع يديه، ثم كبر ورفع يديه للركوع، ثم قال: سمع الله لمن حمده، ثم رفع يديه، ثم قال: هكذا فاصنعوا، ولا يرفع بين السجدين. ”کیا میں تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز پڑھ کر نہ دکھاؤں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ اکبر کہا اور رفع الیدین کیا، پھر اللہ اکبر کہا اور رکوع کے لیے رفع الیدین کیا، پھر سمع اللہ لمن حمدہ کہا اور رفع الیدین کیا، پھر فرمایا، تم ایسا ہی کیا کرو! آپ دو سجدوں کے درمیان رفع الیدین نہیں کرتے تھے۔“
(سنن الدارقطنی: ۲۹۲/۸، ح: ۱۱۱۱، وسندہ صحیح)

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ورجاله ثقات. ”اس حدیث کے راوی ثقہ ہیں۔“

(التلخیص الحبیبر: ۲۱۹/۸)

اس حدیث سے ”بعض الناس“ کا یہ کہنا کہ ”۹ مقامات پر رفع الیدین کا اثبات اور ۱۸ مقامات پر نفی دکھاؤ“ باطل و مردود ٹھہرتا ہے، کیونکہ سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد رفع الیدین کر رہے ہیں، رفع الیدین والی نماز کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز قرار دے رہے ہیں، ہمیں بھی رفع الیدین کرنے کا حکم دے رہے ہیں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو رفع الیدین کرتے دیکھا، وہاں کیا، جہاں نہیں دیکھا، وہاں نہیں کیا۔

دلیل نمبر ۷ : سیدنا ابو حمید الساعدی رضی اللہ عنہ نے دس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں

نماز پڑھ کر دکھائی، نماز شروع کرتے وقت، رکوع جاتے، رکوع سے سر اٹھاتے اور دو رکعتوں سے اٹھتے وقت

رفع الیدین کیا تو دس کے دس صحابہ کرام نے کہا:

صدقت، ہکذا کان یصلی النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ ”آپ نے سچ کہا ہے، نبی کریم ﷺ اسی طرح نماز پڑھتے تھے۔“

(مسند الامام احمد: ۴۲۴/۵، سنن ابی داؤد: ۷۳۰، سنن الترمذی: ۳۰۴، وسندہ صحیح)

اس حدیث کو امام ترمذی رحمہ اللہ نے ”حسن صحیح“ کہا ہے، امام ابن خزیمہ (۵۸۷ھ) امام ابن الجارود (۱۹۲)، امام ابن حبان (۱۸۶۵)، اور حافظ خطابی (معالم السنن: ۱۹۴/۸) رحمہم اللہ نے اس حدیث کو ”صحیح“ قرار دیا ہے۔

حافظ نووی رحمہ اللہ نے بھی اس کو ”صحیح“ کہا ہے۔ (خلاصة الاحکام: ۳۵۳/۱)

حافظ ابن قیم الجوزیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں: حدیث ابی حمید هذا حدیث صحیح متلقی بالقبول، لا علة له، وقد اعلمه قوم بما برأه الله أئمة الحديث منه، ونحن نذكر ما عللوا به، ثم نبين فساد تعليلهم وبطلانه بعون الله... ”یہ حدیث صحیح ہے، اسے امت نے صحت و عمل کے لحاظ سے قبول کیا ہے، اس میں کوئی علت نہیں، ہاں! اسے ایک قوم (احناف) نے ایسی علت کے ساتھ معلول کہا ہے، جس سے اللہ تعالیٰ نے ائمہ حدیث کو بری کر دیا ہے، ہم ان کی بیان کردہ علتوں کو ذکر کریں گے، پھر اللہ تعالیٰ کی توفیق اور مدد سے ان کا فاسد و باطل ہونا بیان کریں گے۔“ (تہذیب السنن لابن القيم: ۴۱۷/۲)

امام محمد بن یحییٰ الذہلی ابو عبد اللہ النیسابوری رحمہ اللہ (م ۲۵۸ھ) فرماتے ہیں:

”جو آدمی یہ حدیث سن لے اور پھر رکوع سے پہلے اور رکوع سے سر اٹھانے کے بعد رفع الیدین نہ

کرے، اس کی نماز ناقص ہے۔“ (صحیح ابن خزیمہ: ۲۹۸/۱، وسندہ صحیح)

دلیل نمبر ۸: امام ابو اسماعیل محمد بن اسماعیل سلمیٰ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے ابو نعمان

محمد بن فضل رحمہ اللہ کی اقتدا میں نماز پڑھی، انہوں نے نماز شروع کرتے وقت، رکوع جاتے وقت اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع الیدین کیا، میں نے ان سے اس بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا، میں نے امام حماد بن زید رحمہ اللہ کی اقتدا میں نماز پڑھی، انہوں نے نماز شروع کرتے وقت، رکوع جاتے وقت اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع الیدین کیا، میں نے ان سے اس بارے میں سوال کیا تو انہوں نے فرمایا، میں نے امام ایوب سختیانی رحمہ اللہ کی اقتدا میں نماز پڑھی، وہ نماز شروع کرتے، رکوع کو جاتے وقت اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع الیدین کرتے تھے، میں نے پوچھا تو آپ نے فرمایا، میں نے امام عطاء بن ابی رباح کی اقتدا میں نماز پڑھی، وہ نماز

شروع کرتے، رکوع جاتے اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع الیدین کرتے تھے، میں نے جب آپ سے اس بارے میں سوال کیا تو امام عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، میں نے (صحابی رسول) سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی اقتدا میں نماز پڑھی، آپ رضی اللہ عنہ نماز شروع کرتے، رکوع جاتے اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع الیدین کرتے تھے، امام عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں، میں نے رفع الیدین کے بارے میں سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے سوال کیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا، میں نے (اپنے نانا) سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اقتدا میں نماز ادا کی، آپ رضی اللہ عنہ نماز شروع کرتے، رکوع جاتے اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع الیدین کرتے تھے اور (خلیفہ اول) سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا، میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا میں نماز پڑھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز شروع کرتے، رکوع کو جاتے اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع الیدین فرماتے تھے۔“

(السنن الکبریٰ للبیہقی: ۷۳/۲، وسندہ صحیح)

خود امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: رواۃ ثقات . ”اس حدیث کے راوی ثقہ ہیں۔“

حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ (المہذب فی اختصار السنن الکبیر: ۴۹/۲) اور حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ (التلخیص الحبیبر: ۲۱۹/۱) نے اس حدیث کے راویوں کو ”ثقہ“ قرار دیا ہے۔

قارئین کرام! اس سنہری کڑی پر غور کریں تو ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی رفع الیدین کرتے تھے، اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ وہ ہمیں بھی اس سنت کو اپنانے کی توفیق سے نوازے۔ آمین یا رب العالمین!

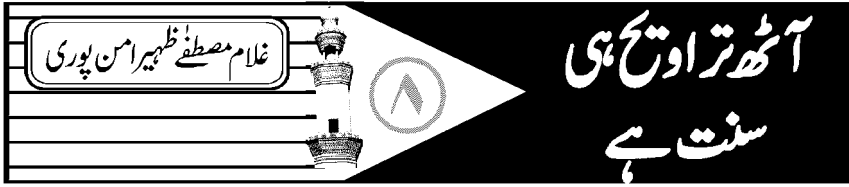
تنبیہ: الامام الثقتہ ابو جعفر احمد بن اسحاق بن بہلول البغدادی رحمۃ اللہ علیہ (م ۳۱۸) بیان کرتے

ہیں: ”میں عراقیوں کے مذہب پر تھا تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھے رہے تھے، میں نے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پہلی تکبیر میں اور جب رکوع کرتے اور جب رکوع سے سر اٹھاتے تو رفع الیدین کرتے تھے۔“ (سنن الدارقطنی: ۲۹۲/۱، ح: ۱۱۱۲، وسندہ صحیح)

جن لوگوں کے مذہب کی بنیاد بزرگوں کے خوابوں پر ہے، کیا وہ اس ثقہ امام کے خواب کی صورت میں ملنے والے نبوی عمل کو اپنانے کے لیے تیار ہیں؟

الحاصل: رفع الیدین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی سنت متواترہ ہے جس کا ترک یا نسخ

کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں، بلکہ امت کا اسی پر عمل رہا ہے۔



آٹھ رکعت نماز تراویح ہی سنت ہے، جیسا کہ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث جناب انور شاہ کشمیری دیوبندی لکھتے ہیں: ”یہ تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ نبی کریم ﷺ کی تراویح آٹھ رکعات تھی اور کسی ایک روایت سے بھی ثابت نہیں کہ آپ ﷺ نے رمضان میں تہجد اور تراویح الگ الگ پڑھی ہوں۔“

(العرف الشذی: ۱۶۶/۱)

جناب خلیل احمد سہارنپوری دیوبندی (م ۱۳۳۶ھ) لکھتے ہیں: ”ابن ہمام (نے) آٹھ کو سنت اور زائد کو مستحب لکھا ہے، سو یہ قول قابل طعن کے نہیں۔“ (براہین قاطعہ: ۷۸)

مزید لکھتے ہیں: ”سنت مؤکدہ ہونا تراویح کا آٹھ رکعت تو باتفاق ہے، اگر خلاف ہے تو بارہ میں۔“ (براہین قاطعہ: ۱۹۵)

جناب اشرف علی تھانوی دیوبندی (۱۲۸۰-۱۳۶۲ھ) کہتے ہیں: ”بیماروں کو تو کہہ دیتا ہوں کہ تراویح آٹھ پڑھو، مگر تندرستوں کو نہیں کہتا۔“ (الکلام الحسن: ۸۹/۲)

جناب عبدالشکور فاروقی لکھنوی دیوبندی (م ۱۳۸۱ھ) لکھتے ہیں: ”اگرچہ نبی کریم ﷺ سے آٹھ تراویح مسنون ہے اور ایک ضعیف روایت میں ابن عباس سے بیس رکعت بھی۔“

(علم الفقہ از عبد الشکور دیوبندی: ۱۹۸)

یہی بات امام احناف ابن ہمام حنفی (فتح القدیر: ۴۶۸/۱)، امام عینی حنفی (عمدة القاری: ۱۷۷/۷)، امام ابن نجیم حنفی (البحر الرائق: ۶۶/۲)، ابن عابدین شامی حنفی (رد المحتار: ۵۲۷/۱)، ابوالحسن شرنبلالی حنفی (مراقی الفلاح: ۲۲۴)، طحاوی حنفی (حاشیة الطحطاوی علی الدر المختار: ۲۹۵/۱) وغیرہم نے پیش کی ہے۔

حنفی و دیوبندی ”علماء و فقہاء“ کے آٹھ رکعت مسنون تراویح کے فیصلے کے بعد اب ہم انتہائی اختصار کے ساتھ آٹھ رکعت نماز تراویح کے سنت ہونے پر دلائل ذکر کرتے ہیں:

دلیل نمبر ①: ابوسلمہ بن عبد الرحمن نے ام المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے سوال کیا کہ رمضان المبارک میں رسول اللہ ﷺ کی رات کی نماز (تراویح) کی کیا کیفیت ہوتی تھی؟ تو سیدہ عائشہ

صدیقہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”ما کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یزید فی رمضان ولا فی غیرہ علی احدى عشرة رکعة .“ ”رسول اللہ ﷺ رمضان ہوتا یا غیر رمضان، گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔“ (صحیح بخاری: ۱۵۴/۸ ح: ۱۱۴۷/۸، ۲۶۹/۸ ح: ۲۰۱۳، صحیح مسلم: ۲۵۴/۸ ح: ۷۳۸)

جمہور علماء امام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے آٹھ رکعت تراویح ثابت کرتے ہیں، جیسا کہ امام ابوالعباس احمد بن عمر بن ابراہیم القرطبی (م ۲۵۶ھ) لکھتے ہیں:

ثم اختلف فی المختار من عدد القيام وقال كثير من أهل العلم : احدى عشرة ركعة ، أخذنا بحديث عائشة المتقدم . ”پھر قیام کے عدد مختار میں اختلاف کیا گیا ہے، کثیر علماء کرام نے کہا ہے کہ یہ گیارہ رکعت ہے، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا والی اس حدیث سے دلیل لیتے ہوئے جو گزر چکی ہے۔“ (المفہم لما اشکل من تلخیص کتاب مسلم: ۳۸۹/۲-۳۹۰)

اس حدیث کی شرح میں جناب انور شاہ کشمیری دیوبندی لکھتے ہیں:

هذه الرواية رواية الصحيحين ، وفي الصحاح صلاة تراويحه عليه السلام ثمانی ركعات ، وفي السنن الكبرى وغيره بسند ضعيف من جانب أبي شيبة ، فإنه ضعيف اتفاقاً ، عشرون ركعة، الآن انما هو سنة خلفاء الراشدين ، ويكون مرفوعاً حكماً وان لم نجد اسناده قوياً . ”یہ صحیح بخاری و صحیح مسلم کی روایت ہے اور صحیح احادیث سے نبی کریم ﷺ کی نماز تراویح آٹھ رکعت ثابت ہے اور سنن کبریٰ میں بیس رکعتوں والی روایت ضعیف سند کے ساتھ ابوشیبہ سے آئی ہے، جو کہ باتفاق ضعیف ہے اور بیس رکعتیں خلفائے راشدین کی سنت ہے اور مرفوع کے حکم میں ہے، اگرچہ اس کی قوی سند ہمیں نہیں ملی۔“ (العرف الشدی: ۱۰۷)

دیکھئے! شاہ صاحب کس طرح آٹھ رکعت تراویح نبی کریم ﷺ سے صحیح بخاری و صحیح مسلم میں ثابت کر رہے ہیں اور ساتھ ہی حنفی مذہب کی کمزوری و معذوری پیش کر رہے ہیں کہ ہم بیس رکعت تراویح نبی کریم ﷺ سے قوی سند کے ساتھ نہیں پاسکے، آپ خود اندازہ فرمائیں کہ ایک مسئلہ جو قوی سند کے ساتھ ثابت بھی نہ ہو، پھر صحیح بخاری و صحیح مسلم کی متفق علیہ حدیث کے خلاف بھی ہو، اس کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے؟

ہم کہتے ہیں کہ خلفائے راشدین سے کسی وضعی (من گھڑت) روایت سے بھی بیس رکعت نماز تراویح پڑھنا ثابت نہیں ہے، لہذا بیس رکعت تراویح کو خلفائے راشدین کی سنت قرار دینا صریح غلطی ہے۔

جناب انور شاہ کاشمیری دیوبندی کے علاوہ متعدد حنفی فقہاء نے بھی اس حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا کو آٹھ رکعت تراویح کی دلیل بنایا ہے اور تسلیم کیا ہے کہ نماز تراویح اور تہجد میں کوئی فرق نہیں ہے، یہ ایک ہی نماز کے دو مختلف

نام ہیں۔ (تفصیل کیلئے دیکھیں فیض الباری: ۴۲۰/۲ وغیرہ)

دلیل نمبر ۲: سیدنا جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

صَلَّى بِنَا رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي شَهْرِ رَمَضَانَ ثَمَانِ رَكَعَاتٍ وَأَوْتَرُ .
 ”اللہ کے رسول ﷺ نے ہمیں ماہ رمضان میں آٹھ رکعت نماز تراویح اور وتر پڑھائے۔“

(مسند ابی یعلیٰ: ۳۲۶/۲، المعجم الصغير للطبرانی: ۱۹۰/۱، فتح الباری: ۱۲/۳، وسندہ حسن)

اس روایت کے راوی عیسیٰ بن جاریہ جمہور محدثین کے نزدیک ”موثق، حسن الحدیث“ ہیں۔ اس حدیث کو امام ابن خزیمہ (۱۰۷۰) اور امام ابن حبان (۲۴۰۹) رحمہما علیہما نے ”صحیح“ کہا ہے۔

حافظ ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”و اسنادہ وسط .“ ”اس کی سند اچھی ہے۔“ (میزان الاعتدال: ۳۱۷/۳)

امام عینی حنفی (عمدة القاری: ۱۷۷/۷) اور دیگر فقہاء نے اس حدیث کو آٹھ رکعت نماز تراویح پر دلیل بنایا ہے۔

دلیل نمبر ۳: سیدنا جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ رسول

کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی، اے اللہ کے رسول! آج رات مجھ سے ایک کام ہوا ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا، وہ کیا اے ابی؟ سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے عرض کی، میرے گھر کی عورتوں نے مجھے کہا، ہم قرآن کریم پڑھی ہوئی نہیں، اس لیے ہم آپ کے ساتھ نماز پڑھیں گی:

فَصَلَّيْتُ بَهْنِ ثَمَانِ رَكَعَاتٍ ، ثُمَّ أَوْتَرْتُ ، فَكَانَتْ سَنَّةَ الرِّضَا ، وَلَمْ يَقُلْ شَيْئًا .

”میں نے انہیں آٹھ رکعت تراویح پڑھائیں، پھر وتر پڑھائے، اس بات پر آپ ﷺ نے رضامندی کا

اظہار فرمایا اور کچھ نہیں کہا۔“ (مسند ابی یعلیٰ: ۳۲۶/۲، زوائد مسند الامام احمد: ۱۱۵/۵، المعجم الاوسط للطبرانی: ۱۴۷/۴، قیام

اللیل للمروزی: ۲۱۷، وسندہ حسن)

اس حدیث کو امام ابن حبان رحمہ اللہ (۲۵۵۰) نے ”صحیح“ کہا ہے، حافظ پیشی نے اس کی سند کو ”حسن“ کہا

ہے۔ (مجمع الزوائد: ۷۴/۲)

دلیل نمبر ۴: صحابی رسول سیدنا سائب بن یزید رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

أمر عمر بن الخطاب أبي بن كعب وتميمًا الداري أن يقيوما للناس باحدى عشرة ركعة .

”سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابی بن کعب اور سیدنا تمیم داری رضی اللہ عنہما کو حکم دیا تھا کہ وہ لوگوں کو گیارہ رکعت نماز تراویح (مع وتر) پڑھایا کریں۔“ (موطا امام مالک: ۱۳۸، شرح معانی الآثار للطحاوی: ۲۹۳/۱، السنن الکبریٰ للبیہقی: ۴۹۶/۲، مشکاة المصابیح: ۴۰۷/۸، وسندہ صحیح)

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا یہ حکم صحیح بخاری و صحیح مسلم والی حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا کے موافق ہے، سیدنا امیر المؤمنین، شہید محراب کا حکم محمد رسول اللہ ﷺ کے عمل کے عین مطابق ہے، اس حدیث سے ثابت ہوا کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں آٹھ رکعت تراویح پڑھانے کا حکم دیا تھا اور اس سے بیس رکعت تراویح کے قائلین و عاملین کا رد ہوتا ہے اور ان کا بیس رکعتوں کے سنت مؤکدہ ہونے کا مفروضہ باطل ٹھہرتا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم بیس رکعت نماز تراویح اس لیے پڑھتے ہیں کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے بیس پڑھی تھیں، یہ بات سیدنا عمر رضی اللہ عنہ پر بہتان اور سراسر جھوٹ ہے، کسی وضعی (من گھڑت) روایت سے بھی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے بیس رکعت تراویح پڑھنا ثابت نہیں ہے۔

ثابت ہوا کہ عہد فاروقی میں آٹھ رکعت تراویح پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع تھا۔

دلیل نمبر ⑤ : سیدنا سائب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

انّ عمر جمع الناس على أبي وتميم، فكانا يصلّيان احدى عشرة ركعة .
”سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو سیدنا ابی بن کعب اور سیدنا تمیم داری رضی اللہ عنہما پر جمع کر دیا، وہ دونوں گیارہ رکعت نماز تراویح پڑھاتے تھے۔“ (مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۹۷/۲-۳۹۲، تاریخ المدینہ للامام عمر بن شبہ: ۷۱۳/۲، وسندہ صحیح)

دلیل نمبر ⑥ : سیدنا سائب بن یزید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

کنّا نقوم فی زمان عمر بن الخطاب باحدى عشرة ركعة

”ہم (صحابہ) سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں گیارہ رکعت (نماز تراویح) پڑھتے تھے۔“

(سنن سعید بن منصور بحوالہ الحاوی للفتاویٰ للسيوطی: ۳۴۹/۸، حاشیہ آثار السنن للنیعمی: ۲۵۰، وسندہ صحیح)

علامہ سبکی لکھتے ہیں: اسنادہ فی غایۃ الصّحّۃ . ”اس کی سند انتہاء درجہ کی صحیح ہے۔“

(شرح المنہاج بحوالہ الحاوی للفتاویٰ: ۳۵۰/۸)

مذکورہ بالا دلائل سے ثابت ہوا کہ آٹھ رکعت نماز تراویح رسول کریم ﷺ کی سنت ہے اور سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابی بن کعب و سیدنا تمیم داری رضی اللہ عنہما کو وتر سمیت گیارہ رکعت نماز تراویح پڑھانے کا حکم دیا اور انہوں نے آپ کے حکم کی تعمیل و تکمیل میں گیارہ رکعت نماز تراویح پڑھائی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پڑھی۔

دعا ہے کہ اللہ رب العزت ہمیں بھی سنت پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

بیس رکعت تراویح کے دلائل کا جائزہ

اب ہم ان لوگوں کے دلائل کا علمی و تحقیقی مختصر، مگر جامع جائزہ پیش کرتے ہیں جو بیس رکعت نماز تراویح کو ”سنت مؤکدہ“ کہتے ہیں۔

دلیل نمبر ①: سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ رمضان المبارک میں بیس رکعتیں اور وتر پڑھا کرتے تھے۔

(مصنف ابن ابی شیبہ: ۲۹۴/۲ السنن الکبریٰ للبیہقی: ۴۹۶/۲ المعجم الکبیر للطبرانی: ۳۹۳/۱ وغیرہم)

تبصرہ: یہ جھوٹی روایت ہے، اس کی سند میں ابوشیبہ ابراہیم بن عثمان راوی ”متروک الحدیث“ اور ”کذاب“ ہے، جمہور نے اس کی ”ضعیف“ کر رکھی ہے۔

امام زیلعی حنفی لکھتے ہیں: وهو معلول بأبی شیبہ ابراہیم بن عثمان، جد الامام أبی بکر بن أبی شیبہ، وهو متفق علی ضعفه، ولینہ ابن عدی فی الکامل، ثم انه مخالف للحديث الصحيح عن أبی سلمة بن عبد الرحمن أنه سأل عائشة: كيف كانت صلاة رسول الله صلى الله عليه وسلم في رمضان؟ قالت: ما كان يزيد في رمضان ولا في غيره على إحدى عشرة ركعة.. ”یہ روایت ابوشیبہ ابراہیم بن عثمان راوی کی وجہ سے معلول (ضعیف) ہے، جو کہ امام ابوبکر بن ابی شیبہ کے دادا ہیں، ان کے ضعیف ہونے پر اتفاق ہے، امام ابن عدی نے بھی اکامل میں ان کو کمزور قرار دیا ہے، پھر یہ اس صحیح حدیث کے مخالف بھی ہے، جس میں ابوسلمہ بن عبد الرحمن نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ ﷺ کی رمضان میں نماز کے بارے میں سوال کیا تو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا، آپ ﷺ رمضان یا غیر رمضان میں گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔۔۔“ (نصب الراية للزيلعي: ۱۵۳/۲)

(۱) جناب انور شاہ کشمیری دیوبندی لکھتے ہیں: أما النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فصَحَّ عنه ثمان ركعات وأما عشرون ركعة فهو عنه عليه السلام بسند ضعيف وعلى ضعفه اتفاق . ”آٹھ رکعات نماز تراویح رسول اللہ ﷺ سے صحیح ثابت ہیں اور جو بیس رکعت کی روایت ہے، وہ ضعیف ہے اور اس کے ضعیف ہونے پر اتفاق ہے۔“ (العرف الشذی: ۱۶۶/۱)

بالا اتفاق ”ضعیف“ راوی کی روایت وہی پیش کر سکتا ہے جو خود اس کی طرح بالاتفاق ”ضعیف“ ہو۔

(۷) جناب عبدالشکور فاروقی دیوبندی نے بھی اس کو ”ضعیف“ قرار دیا ہے۔ (علم الفقہ: ص ۱۹۸)

(۸) ابن عابدین شامی حنفی (۱۲۵۲ھ) لکھتے ہیں: فضعیف بأسی شعبة، متفق علی ضعفه مع مخالفة للصحيح. ”یہ حدیث ضعیف ہے، کیونکہ اس میں راوی ابوشیبہ (ابراہیم بن عثمان) بالاتفاق ضعیف ہے، ساتھ ساتھ یہ حدیث (صحیح بخاری و صحیح مسلم کی) صحیح (حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا) کے بھی خلاف ہے۔“ (منحة الخالق: ۶۶/۲)

یہی بات امام ابن ہمام حنفی (فتح القدیر: ۴۲۷/۸) اور امام عینی حنفی (عمدة القاری: ۱۲۸/۸) نے بھی کہی ہے۔

علامہ سیوطی (۸۴۹-۹۱۱ھ) لکھتے ہیں: هذا الحديث ضعيف جدًا، لا تقوم به حجة.

”یہ حدیث سخت ترین ضعیف ہے، اس سے حجت و دلیل قائم نہیں ہو سکتی۔“ (المصابیح فی صلاة التراويح: ۱۷)

تنبیہ: امام بریلویت احمد یار خان گجراتی (۱۳۲۳-۱۳۹۱ھ) اپنی کتاب ”جاء الحق“ (۲۴۳/۲) میں ”نماز جنازہ میں الحمد شریف تلاوت نہ کرو“ کی بحث میں امام ترمذی رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہیں:

”ابراہیم بن عثمان ابوشیبہ منکر حدیث ہے۔“

لیکن اپنی اسی کتاب (۴۴۷/۸) کے ضمیمہ میں مندرج رسالہ لمعات المصابیح علی رکعات التراويح میں اس کی حدیث کو بطور حجت پیش کرتے ہیں، دراصل انصاف کو ان سے شکایت ہے کہ وہ اس کا ساتھ نہیں دیتے، ایسے بدویان اور جاہل، بلکہ اجہل لوگوں سے خیر کی کیا توقع رکھی جاسکتی ہے جو اس طرح کی واہی تباہی مچاتے ہیں؟

قارئین کرام! بعض الناس کی یہ کل کائنات تھی جس کا حشر آپ نے دیکھ لیا ہے، نہ معلوم اس کے باوجود ان لوگوں کو بیس رکعات نماز تراویح کو ”سنت مؤکدہ“ کہتے ہوئے شرم کیوں نہیں آتی؟

دلیل نمبر ۲: سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رمضان المبارک میں ایک رات نبی ﷺ باہر تشریف لائے اور صحابہ کرام کو چوبیس رکعتیں پڑھائیں اور تین رکعات وتر پڑھے۔

(تاریخ جرجان لابی قاسم حمزة بن يوسف السهمی المتوفی ۷۲۷ من الهجرة: ص ۲۷۵)

تبصرہ: یہ روایت جھوٹ کا پلندہ ہے، اس میں دو راوی عمر بن ہارون النخعی اور محمد بن حمید الرازی ”متروک و کذاب“ ہیں، نیز ایک غیر معروف راوی بھی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ بیس تراویح کے سنت مؤکدہ ہونے کا راگ الاپنے والے اس چوبیس والی حدیث

کو کس منہ سے پیش کرتے ہیں؟

دلیل نمبر ۳: سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے انہیں حکم دیا کہ وہ رمضان میں رات کو لوگوں کو نماز پڑھایا کریں، آپ نے فرمایا، لوگ دن میں روزہ رکھتے ہیں، لیکن اچھی طرح قراءت نہیں کر سکتے، اگر تم رات کو ان پر قرآن پڑھا کرو تو اچھا ہو، سیدنا ابی بن کعب نے عرض کی، اے امیر المؤمنین! پہلے ایسا نہیں ہوا تو آپ نے فرمایا، مجھے بھی معلوم ہے، تاہم یہ ایک اچھی چیز ہے، چنانچہ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو بیس رکعات پڑھائیں۔ (کنز العمال: ۴۹/۸)

تبصرہ: ”کنز العمال“ میں اس کی سند مذکور نہیں، دین سند کا نام ہے، بے سند روایات وہی پیش کرتے ہیں، جن کی اپنی کوئی ”سند“ نہ ہو۔

دلیل نمبر ۴: عن الحسن أن عمر بن الخطاب رضي الله عنه جمع الناس على أبي بن كعب، فكان يصلي لهم عشرين ركعة. ”حسن بصری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ پر اکٹھا کیا، وہ انہیں بیس رکعات پڑھاتے تھے۔“ (سنن ابی داؤد، سیر اعلام النبلاء: ۴۰۰/۸، جامع المسانید والسنن للحافظ ابن کثیر: ۵۵/۱)

تبصرہ: ① عشرين ركعة کے الفاظ دیوبندی تحریف ہے، محمود الحسن دیوبندی (۱۲۶۸-۱۳۳۹ھ) نے یہ تحریف کی ہے، عشرين ليلة ”بیس راتیں“ کی بجائے عشرين ركعة ”بیس رکعتیں“ کر دیا ہے۔

جبکہ سنن ابی داؤد کے کسی نسخہ میں عشرين ركعة نہیں ہے، تمام نسخوں میں عشرين ليلة ہی ہے، حال ہی میں محمد عوامہ کی تحقیق سے جو سنن ابی داؤد کا نسخہ چھپا ہے، جس میں سات آٹھ نسخوں کو سامنے رکھا گیا ہے، اس میں بھی عشرين ليلة ہی ہے، محمد عوامہ لکھتے ہیں: من الأصول كلها .

”سارے کے سارے بنیادی نسخوں میں یہی الفاظ ہیں۔“ (سنن ابی داؤد بتحقیق محمد عوامہ: ۲۵۶/۲)

عشرين ركعة کے الفاظ محرف ہونے پر ایک زبردست دلیل یہ بھی ہے کہ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ (السنن الکبریٰ:

۴۹۸/۲) نے یہی روایت امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ کی سند سے ذکر کی ہے اور اس میں عشرين ليلة کے الفاظ ہیں۔

یہی الفاظ حنفی فقہاء اپنی اپنی کتابوں میں ذکر کرتے رہے ہیں۔

رہا مسئلہ ”سیر اعلام النبلاء“ اور ”جامع المسانید والسنن“ میں عشرين ركعة کے الفاظ کا پایا جانا

تو یہ ناخین کی غلطی ہے، کیونکہ سنن ابی داؤد کے کسی نسخے میں یہ الفاظ نہیں ہیں، یہاں تک کہ امام عینی حنفی (م ۸۵۵ھ) نے ”شرح أبی داؤد (۳۴۳/۵)“ میں عشرين لیلة کے الفاظ ذکر کیے ہیں، نسخوں کا اختلاف ذکر نہیں کیا، اگر رکعة کے الفاظ کسی نسخے میں ہوتے تو امام عینی حنفی ضرور بالضرورة نقل کرتے، اسی لیے غالی حنفی نیوی (م ۱۳۲۲ھ) نے بھی اس کو بیس رکعت تراویح کی دلیلوں میں ذکر نہیں کیا۔

② اگر مقلدین کی بات کو صحیح تسلیم کر بھی لیا جائے تو پھر بھی یہ روایت ان کی دلیل نہیں بن سکتی، جیسا کہ خلیل احمد سہارنپوری دیوبندی صاحب (۱۲۶۹-۱۳۳۶ھ) لکھتے ہیں کہ ایک عبارت بعض نسخوں میں ہوا اور بعض میں نہ ہو تو وہ مشکوک ہوتی ہے۔ (بذل المجہود: ۴۷/۴، بیروت)

لہذا اس دیوبندی اصول سے بھی یہ روایت مشکوک ہوئی۔

تنبیہ: امام بریلویت احمد یار خان نعیمی گجراتی (۱۳۲۳-۱۳۹۱ھ) نے عشرين لیلة کے

الفاظ ذکر کیے ہیں۔ (»جاء الحق«: ۹۵/۲، بحث »قنوت نازلہ پڑھنا منع ہے«)

جناب سرفراز خان صفدر دیوبندی ایک دوسری روایت کے بارے میں لکھتے ہیں:

”جب عام اور متداول نسخوں میں یہ عبارت نہیں تو شاذ اور غیر مطبوعہ نسخوں کا کیا اعتبار ہو سکتا ہے؟“

(خزائن السنن: ۹۷/۲)

مقلدین کے اصول کے مطابق اس روایت کا کوئی اعتبار نہیں۔

③ امام زیلیعی حنفی (م ۶۲۷ھ) اور امام عینی حنفی لکھتے ہیں: لم یدرک عمر بن الخطاب .

”اس روایت کے راوی امام حسن بصری رحمہ اللہ نے سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا۔“

(نصب الراية: ۱۲۶/۲، شرح ابی داؤد از عینی حنفی: ۳۴۳/۵)

لہذا یہ روایت ”منقطع“ ہوئی، کیا شریعت ”منقطع“ روایات کا نام ہے؟

④ امام عینی حنفی نے اس کو ”ضعیف“ قرار دیا ہے۔ (شرح سنن ابی داؤد از عینی حنفی: ۳۴۳/۵)

⑤ اس روایت کو حافظ نووی رحمہ اللہ نے بھی ”ضعیف“ کہا ہے۔ (خلاصة الاحکام للنووی: ۵۶۵/۱)

⑥ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا گیارہ رکعت تراویح جمع وتر کا حکم دینا ثابت ہے۔

(موطا امام مالک: ۱۳۸، السنن الکبریٰ للبیہقی: ۴۹۶/۲، شرح معانی الآثار للطحاوی: ۲۹۳/۱، معرفة السنن والآثار

للبیہقی: ۴۲/۴، فضائل الاوقات للبیہقی: ۲۷۴، قیام اللیل للمروزی: ۲۲۰، مشکاة المصابیح: ۴۰۷/۱، وسندہ صحیح)

امام طحاوی حنفی (۲۳۹-۳۲۱ھ) نے اس حدیث سے حجت پکڑی ہے

دلیل نمبر ۴ : یزید بن رومان کہتے ہیں کہ لوگ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانہ

خلافت میں رمضان میں تینیس رکعات پڑھا کرتے تھے۔ (موطا امام مالک : ۹۸/۱، السنن الکبریٰ للبیہقی : ۴۹۴/۲)

تبصرہ : یہ روایت ”انقطاع“ کی وجہ سے ”ضعیف“ ہے، کیونکہ راوی یزید بن رومان نے سیدنا

عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا زمانہ ہی نہیں پایا، امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں : یزید بن رومان لم یدرک عمر

بن الخطاب . ”یزید بن رومان نے سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا۔“ (نصب الراية للزیلعی : ۱۶۳/۲)

لہذا یہ روایت ”منقطع“ ہوئی، جبکہ موطا امام مالک میں اس ”منقطع“ روایت سے متصل پہلے ہی ”صحیح و

متصل“ سند کے ساتھ ثابت ہے کہ امیر المؤمنین سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے گیارہ رکعت کا حکم دیا تھا۔

جناب انور شاہ کشمیری دیوبندی لکھتے ہیں : ترجیح المتصل علی المنقطع .

”ضابطہ یہ ہے کہ متصل کو منقطع پر ترجیح حاصل ہوتی ہے۔“ (العرف الشذی : ۱۱)

ہم کہتے ہیں کہ یہاں بے ضابطگیاں کیوں؟ جناب اشرف علی تھانوی دیوبندی اس روایت کے بارے

میں لکھتے ہیں : ”روایت موطا مالک منقطع ہے۔“ (اشرف الجواب : ۱۷۲)

صحیح احادیث کے مقابلہ میں ”منقطع“ روایت سے حجت پکڑنا انصاف کا خون کرنے کے مترادف ہے۔

دلیل نمبر ۵ : یحییٰ بن سعید سے روایت ہے کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو

حکم دیا کہ وہ لوگوں کو تین رکعات پڑھائے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ : ۳۹۳/۲)

تبصرہ : یہ روایت ”منقطع“ ہونے کی وجہ سے ”ضعیف“ ہے، نیوی حنفی لکھتے ہیں :

یحییٰ بن سعید لم یدرک عمر . ”یحییٰ بن سعید الانصاری نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ

نہیں پایا۔“ (التعلیق الحسن از نیوی حنفی : ۲۵۳)

دلیل نمبر ۶ : عبدالعزیز بن رفیع فرماتے ہیں کہ سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ رمضان میں

لوگوں کو دینہ میں تین رکعات پڑھاتے تھے اور تین رکعات۔ (مصنف ابن ابی شیبہ : ۳۹۳/۲)

تبصرہ : یہ روایت بھی ”انقطاع“ کی وجہ سے ”ضعیف“ ہے، نیوی حنفی لکھتے ہیں :

عبدالعزیز بن رفیع لم یدرک ابی بن کعب . ”عبدالعزیز بن رفیع نے سیدنا ابی بن

کعب رضی اللہ عنہ کو نہیں پایا۔“ (التعلیق الحسن : ۲۵۳)

دلیل نمبر ④ : سائب بن یزید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ لوگ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت

میں رمضان میں بیس رکعتیں پڑھتے تھے۔ (مسند علی بن الجعد: ۲۸۲۵ السنن الکبریٰ للبیہقی: ۴۹۶/۲، وسندہ صحیح)

تبصرہ : یہ بیس رکعتیں پڑھنے والے لوگ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے علاوہ اور لوگ تھے، کیونکہ صحابی

رسول سیدنا سائب بن یزید خود فرماتے ہیں: کُنَّا (أَي الصَّحَابَةِ) نَقُومُ فِي عَهْدِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ

بِاحْدَى عَشْرَةِ رَكْعَةٍ ... ”ہم (صحابہ) سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دور میں گیارہ رکعات

(نماز تراویح جمع وتر) پڑھتے تھے۔“ (حاشیہ آثار السنن: ۲۵۰، وسندہ صحیح)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے علاوہ دوسرے لوگوں کا عمل حجت نہیں، یہ کہاں ہے کہ یہ نامعلوم لوگ بیس کو سنت

مؤکدہ سمجھ کر پڑھتے تھے، اگر کوئی آٹھ کو سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور بارہ کو زائد نفل سمجھ کر پڑھتے تو صحیح ہے، یہ لوگ بھی

ایسا ہی کرتے ہوں گے۔

جناب خلیل احمد سہارنپوری دیوبندی (م ۱۳۴۶ھ) لکھتے ہیں: ”ابن ہمام (نے) آٹھ

رکعات کو سنت اور زائد کو مستحب لکھا ہے، سو یہ قول قابل طعن کے نہیں۔“ (براہین قاطعہ: ۱۸)

مزید لکھتے ہیں: ”سنت مؤکدہ ہونا تراویح کا آٹھ رکعت تو باتفاق ہے، اگر خلاف ہے تو بارہ

میں۔“ (براہین قاطعہ: ۱۹۵)

دلیل نمبر ⑤ : سائب بن یزید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں

بیس رکعات تراویح اور وتر پڑھا کرتے تھے۔ (معرفة السنن والآثار للبیہقی: ۴/۴)

تبصرہ : یہ روایت ”شاذ“ ہے، امام مالک، امام یحییٰ بن سعید القطان اور امام الدر اور دی وغیرہم

رحمہم اللہ کے مخالف ہونے کی وجہ سے اس میں ”شذوذ“ ہے، اگرچہ خالد بن مخلد ”ثقة“ راوی ہے، لیکن کبار ثقات کی

مخالفت کرنے کی وجہ سے اس کی روایت قبول نہ ہوگی، اسی روایت میں کبار ثقات گیارہ رکعات بیان کر رہے

ہیں۔

دلیل نمبر ⑥ : ابو عبد الرحمن سلمیٰ کہتے ہیں کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے رمضان میں قراء کو بلایا اور

ان کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو بیس رکعات تراویح پڑھائیں، سیدنا علی رضی اللہ عنہ انہیں وتر پڑھاتے تھے۔

(السنن الکبریٰ للبیہقی: ۴۹۶/۲)

تبصرہ : (۱) یہ روایت ”ضعیف“ ہے، اس کی سند میں حماد بن شعیب راوی ”ضعیف“

ہے، اس کو امام یحییٰ بن معین، امام ابوزرہ، امام نسائی اور حافظ ذہبی رحمہم اللہ نے ”ضعیف“ کہا ہے۔

(۲) دوسری وجہ ”ضعیف“ یہ ہے کہ عطاء بن السائب ”مختلط“ راوی ہے، حماد بن شعیب ان لوگوں میں سے نہیں، جنہوں نے اس سے قبل الاختلاط سنا ہے۔

دلیل نمبر ۱۰ : ابوالحسناء سے روایت ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو حکم دیا کہ وہ

لوگوں کو پانچ تروٹے، یعنی بیس رکعات تراویح پڑھایا کرے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۹۳/۲)

تبصرہ : اس روایت کی سند ”ضعیف“ ہے، اس کی سند میں ابوالحسناء راوی ”مجہول“ ہے۔

حافظ ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: لا یعرف۔ ”یہ غیر معروف راوی ہے۔“ (میزان الاعتدال: ۵۱۵/۴)

اللہ تعالیٰ نے ہمیں غیر معروف راویوں کی روایات کا مکلف نہیں ٹھہرایا۔

دلیل نمبر ۱۱ : اعمش کہتے ہیں کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیس رکعات تراویح پڑھا

کرتے تھے۔ (مختصر قیام اللیل للمروزی: ۱۵۷)

تبصرہ: اس کی سند ”ضعیف“ ہے، عمدة القاری (۱۳۷/۱) میں یہ حفص بن غیاث عن الأعمش کے طریق سے ہے، جبکہ حفص بن غیاث اور اعمش دونوں زبردست ”مدرس“ ہیں اور ”عن“ سے بیان کر رہے ہیں، لہذا سند ”ضعیف“ ہے۔

باقی امام عطاء، امام ابن ابی ملیکہ، امام سوید بن غفلہ وغیرہم کا بیس رکعت پڑھنا بعض الناس کو مفید نہیں، وہ یہ بتائیں کہ وہ امام ابوحنیفہ کے مقلد ہیں یا امام عطاء ابن ابی رباح وغیرہ کے؟ اور اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ وہ بیس رکعت کو سنت مؤکدہ سمجھ کر پڑھتے تھے۔

آل تقلید پر لازم ہے کہ وہ باسنہج اپنے امام ابوحنیفہ سے بیس رکعت تراویح کا جواز یا سنت مؤکدہ ہونا ثابت کریں، ورنہ مانیں کہ وہ اندھی تقلید میں سرگرداں ہیں۔

الحاصل : رسول اللہ ﷺ یا کسی صحابی سے بیس رکعت نماز تراویح پڑھنا قطعاً ثابت

نہیں ہے، سنت صرف آٹھ رکعات ہیں۔

دعا ہے کہ اللہ رب العزت ہمیں حق سمجھنے والا اور اس پر ڈٹ جانے والا بنائے۔ آمین !

صحیح بخاری کا مطالعہ اور فتنہ انکارِ حدیث

حدیثِ افک پر اعتراضات اور ان کے جوابات ③

اعتراض نمبر ④: منکرِ حدیث صاحب صحیح بخاری پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”لیکن میں یقین رکھتا ہوں کہ یہ بھی حضرت عائشہ کی بیان کردہ بات نہیں ہے اور ہرگز ایسا نہیں ہوا کہ ایک ماہ کی طویل بیماری کے زمانہ میں حضور ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایسی بے التفاتی برتی ہو، کیونکہ شرعاً اس بے التفاتی کی کوئی وجہ نہ تھی، بیمار پر تو سنگ دل لوگوں کو بھی رحم آتا ہے، اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ حضرت ام المؤمنین پر واقعی کچھ لوگ الزام لگا رہے تھے تو بلاشبہ ان کے پاس کوئی ثبوت تو نہ تھا کہ ام المؤمنین کو واقعی مجرم قرار دے کر نفرت و اعراض کا مظاہرہ کرنے کی گنجائش ہوتی۔ کسی شخص پر بغیر کسی ثبوت کے الزام لگایا جائے تو وہ مظلوم ہے، پس ام المؤمنین خود نبی اکرم ﷺ کے علم میں بھی قانونِ شرع کی رو سے مظلوم تھیں اور وہ مظلوم ہستی بیمار بھی پڑی ہوئی تھی۔ تو کیا یہ بات تصوّر کرنے کے لائق ہے کہ رحمت للعالمین ﷺ اپنے گھر میں بیمار پڑی ہوئی مظلوم بیوی کو بلا وجہ اعراض و بے التفاتی کی سزا دیتے دیں۔ سُبْحَانَكَ هَذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ۔“

(صحیح بخاری کا مطالعہ: ۱۵۷/۱: ۱۵۲)

جواب: قارئین کرام! منکرینِ حدیث کے اس اعتراض کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو بغیر ثبوت کے ایک بات کو سن کر آپ ﷺ پورا مہینہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے بے التفاتی کیوں کرتے رہے؟ یہ اعتراض عقل و نقل دونوں اعتبار سے واضح طور پر باطل ہے، عقل کے اعتبار سے تو اس طرح کہ ہر ذی شعور سمجھ سکتا ہے کہ رسول کریم ﷺ ان دنوں بے حد پریشان تھے، لہذا اس حدیث میں جس بے التفاتی کا تذکرہ ہے، وہ ”نفرت و اعراض“ کی وجہ سے نہیں تھی، بلکہ آپ ﷺ کی بے حد پریشانی کی وجہ سے تھی، ظاہر ہے کہ آدمی پریشانی میں کسی کی طرف وہ التفات نہیں کر سکتا جو عام حالت میں ہوتا ہے اور نقل کے اعتبار سے اس طرح یہ اعتراض ناقابلِ التفات ہے کہ اسی حدیث میں یہ ذکر موجود ہے کہ آپ ﷺ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس ان دنوں میں جاتے تو ان کا حال دریافت فرماتے تھے، آپ فرماتی ہیں:

ویربیبی فی وجعی انی لا أرى من النبی صلی اللہ علیہ وسلم اللطف الذی كنت أرى منه

حین مرض ، انما یدخل ، فیسلم ، ثم یقول : کیف تیکم ؟
 ”میری تکلیف کے دوران مجھے یہ چیز شک میں ڈالتی تھی کہ میں نبی کریم ﷺ کی طرف سے وہ لطف و کرم نہیں دیکھ رہی تھی جو (عام دنوں میں) بیماری کے دوران دیکھتی تھی، آپ ﷺ تشریف لاتے اور سلام کہتے، پھر فرماتے، تمہارا کیا حال ہے؟“

اس روایت سے تو بالکل وضاحت ہو جاتی ہے کہ آپ ﷺ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ناراض نہ تھے:
 وقد انتهی الحدیث الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والی أبوی ، ولا یدکران لی من ذلک قلیلاً ولا کثیراً ، ألا انی قد انکرت من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعض لطفہ بی...
 ”یہ بات رسول اللہ ﷺ اور میرے والدین تک پہنچ چکی تھی، لیکن وہ مجھ سے اس بارے میں کچھ بھی بات نہ کرتے تھے، ہاں! ایک بات تھی کہ میں رسول اللہ ﷺ کی طرف سے لطف و کرم کی کچھ کمی محسوس کر رہی تھی۔۔۔“ (تاریخ الامم والملوک للطبری : ۱۱۲/۲، وسندہ صحیح)

اب روز روشن کی طرح عیاں ہو گیا ہے کہ آپ ﷺ ان دنوں میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف بھی لاتے، سلام بھی کہتے اور حال بھی دریافت کرتے، بس پریشانی میں ہر انسان کو جو صورت حال لاحق ہو جاتی ہے، وہ آپ ﷺ کو بھی لاحق ہو گئی، جس کی بنا پر آپ پہلے کی طرح التفات نہ کر سکے اور یہ آپ کے بس کی بات بھی نہ تھی، ورنہ تہمت لگنے کے بعد بھی آپ ﷺ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو بے گناہ اور اس الزام کو بے ثبوت ہی سمجھتے تھے، جیسا کہ اسی حدیث کے الفاظ ہیں، آپ نے صحابہ سے فرمایا:

من یعذرنی من رجل بلغنی أذاه فی أهلی ، فواللہ ! ما علمت علی أهلی ألا خیراً ، وقد ذکرنا رجلاً ما علمت ألا خیراً

”جس آدمی (عبداللہ بن اُبی) کی طرف سے میری بیوی کے بارے میں مجھے تکلیف پہنچی ہے، اس سے مجھے انصاف کون دلائے گا، اللہ کی قسم! میں اپنی بیوی کے بارے میں صرف اچھائی ہی جانتا ہوں، انہوں (تہمت لگانے والوں) نے ایسے آدمی کا نام لیا ہے کہ جس کے بارے میں صرف اچھائی ہی جانتا ہوں۔۔۔“
 ثابت ہوا کہ صحیح بخاری پر کیے گئے اس اعتراض کی کوئی عقلی و نقلی حیثیت نہیں۔

اعتراض نمبر ⑧ : سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے رسول کریم ﷺ نے اس معاملے میں جو مشورہ کیا تھا، اس پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”اسامہ بن زید اس وقت جب کاہی

قصہ بتایا جاتا ہے، چودہ پندرہ سال کے لڑکے تھے، ان کے والد حضرت زید رضی اللہ عنہ موجود تھے، جنہیں حضور اکرم ﷺ نے ظہور نبوت سے قبل ہی اپنا بیٹا بنا لیا تھا اور سورۃ احزاب کے نزول تک وہ زید بن محمد ہی کہے جائے تھے، پس اگر آپ کو اپنے اس خانگی امر میں مشورہ لینا ہی تھا تو اسامہ کی بجائے ان کے والد حضرت زید بن حارثہ سے لیتے۔ ایسے اہم امر میں کہیں نوعمر لڑکوں سے مشورہ لیا جاتا ہے۔۔۔“ (مطالعہ: ۱۵۴/۸)

جواب: چودہ پندرہ سال کا لڑکا یقیناً بالغ ہو جاتا ہے، خصوصاً عرب علاقوں میں تو اپنے قریبی عاقل و بالغ آدمی سے مشورہ کرنے میں کیا حرج ہے، نیز یتیموں کی پرورش کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ یتیموں کا مال ان کے حوالے نہ کرو کہ بچے ہونے کی وجہ سے عقل کی کمی کی بنا پر وہ اسے ضائع کر دیں گے، لیکن جب وہ بلوغت کو پہنچ جائیں تو خود اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ فوراً ان کا مال ان کے حوالے کر دیا جائے، جب اللہ تعالیٰ بالغ آدمی کی عقل و دانش کا اعتبار کرتا ہے تو اس کے رسول ﷺ کی طرف سے اسی کام کے کیے جانے پر اعتراض کیوں ہے؟

چودہ پندرہ سال کا لڑکا اگر زیرک اور روشن دماغ ہو تو اکثر وہ بڑی عمر والوں کے مقابلے میں زیادہ بہتر سوچ سکتا ہے، خصوصاً جب وہ سید المرسلین کا تربیت یافتہ ہو اور ”حب رسول“ (رسول کریم ﷺ کا محبوب) کے لقب سے معروف ہو۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا وہ واقعہ بھی اگر میرٹھی صاحب کے ذہن میں ہوتا صحیح بخاری و صحیح مسلم میں موجود ہے تو شاید وہ یہ اعتراض نہ کرتے، رسول اللہ ﷺ نے اس سدا بہار درخت کے بارے میں سوال کیا جس کے پتے کسی موسم میں بھی نہیں گرتے تو سب صحابہ میں سے صرف ابن عمر رضی اللہ عنہما کے ذہن میں اس سوال کا جواب آیا تھا، حالانکہ وہ اس وقت سب سے چھوٹے تھے۔ (صحیح بخاری: ۶۱، صحیح مسلم: ۲۸۱۱)

اب بھی اگر کسی کی سمجھ میں یہ بات نہ آئے تو یہ سوائے ہٹ دھرمی کے اور کچھ نہیں۔

اعتراض نمبر ۹: ”پھر حضور اکرم ﷺ کو وحی کا کیا انتظار تھا؟ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ حضرت ام المؤمنین پر بہتان لگایا گیا تھا تو یہ کوئی پیچیدہ مسئلہ نہ تھا کہ وحی جدید نازل ہو کر اسے حل کرتی۔ افک سے پہلے اللہ تعالیٰ نے یہ قانون نازل فرما دیا تھا کہ جو لوگ پارسا عورتوں پر الزام لگائیں اور ثبوت میں چار گواہ پیش نہ کریں تو انہیں اسی کوڑے مارو اور عمر بھر کے لیے مردود الشہادۃ قرار دے دو اور وہ فاسق ہیں۔ حضرت ام المؤمنین کے مسئلہ میں آپ کو اسی پر عمل کرنا تھا، کیونکہ الزام لگانے والوں کے پاس

ثبوت نام کی تو کوئی چیز تھی نہیں۔۔۔ ایک ماہ تک آپ کا کڑھن اور کبیدگی میں رہنا اور وحی کا انتظار فرمانا اور قرآن کا صاف و صریح حکم نافذ نہ کرنا ہرگز سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔۔۔» (مطالعہ: ۱۵۵/۸)

(جواب) : ① دینی امور میں نبی کریم ﷺ کا ہر قول و فعل وحی الہی سے صادر ہوتا تھا، جیسا کہ قرآن کریم میں اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۖ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ﴾ (النجم: ۴۳) ”آپ اپنی خواہش سے نہیں بولتے، وہ تو بس وحی الہی ہوتی ہے۔“

ہمارا ایمان ہے کہ آپ ﷺ کا اس معاملے میں یہ توقف وحی الہی کی بنا پر تھا، آپ ﷺ کو اسی طرح حکم باری تعالیٰ تھا اور ضروری نہیں کہ توقف کا یہ حکم قرآن میں ہی ملے تو تب ہی ایمان لایا جائے، بلکہ امت کا اجماعی فیصلہ ہے کہ حدیث بھی وحی ہے، جس طرح قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے احکامات نازل ہوتے تھے، اسی طرح حدیث میں بھی نازل ہوتے تھے، ہم اس کی ایک مثال پیش کرنے پر اکتفا کریں گے۔

جب غزوہ بنی نضیر کے موقع پر آپ ﷺ نے اس یہودی قبیلے کے کچھ درخت کاٹ دیئے اور کچھ جلادئیے، اس پر یہ اعتراض کیا گیا کہ اُدھر پیغمبر اسلام فساد فی الارض اور مال کے ضیاع سے منع فرماتے ہیں اور ادھر عملاً خود اس کی خلاف ورزی میں اتنا قیمتی مال ضائع کر رہے ہیں، اس وقت یہ فرمان باری تعالیٰ نازل ہوا: ﴿مَا قَطَعْتُمْ مِّن لِّبْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوهَا قَائِمَةً عَلَىٰ اُصُولِهَا فَبِإِذْنِ اللّٰهِ وَلِيُخْرِىَ الْفَاسِقِينَ﴾ (الحشر: ۵) ”جو کچھ درخت بھی تم نے کاٹا ہے یا جس کو بھی تم نے اپنے

تنے پر (کھڑا) چھوڑ دیا ہے، وہ اللہ کے حکم سے ہے اور تاکہ اللہ فاسقوں کو رسوا کر دے۔“ اب جو شخص مطالبہ کرتا ہے کہ واقعہ اقلک میں آپ ﷺ کے اس توقف کا حکم قرآن کریم سے دکھایا جائے، ہم اس سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ ہمیں غزوہ بنی نضیر کے کچھ درخت کاٹنے اور کچھ جلانے کا حکم قرآن سے دکھا دے، حالانکہ مذکورہ آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف اشارہ بھی فرمایا ہے۔

اگر یہ حکم قرآن کریم میں نہیں ملتا تو واضح ہے حدیث نبوی کی صورت میں یہ وحی الہی نازل ہوئی تھی، بعینہ اس معاملے میں بھی توقف کا حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھا، اتنی سی بات اگر کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو اس میں امام بخاری اور صحیح بخاری کا کوئی قصور نہیں۔

② یہ بھی ضروری نہیں کہ اگر ایک معاملے میں پہلا حکم موجود ہوتا تو نبی کریم ﷺ فوراً اسی پر عمل کرتے

تھے بلکہ بسا اوقات اللہ تعالیٰ نیا حکم بھی نازل فرما دیتے تھے، میرٹھی صاحب نے سورہ نور کی جس آیت کی طرف اشارہ کیا ہے، اسی پر ہی میں غور کرنے سے مسئلہ حل ہو سکتا ہے، وہ اس طرح کہ پہلا عام حکم یہ تھا کہ جو آدمی کسی مسلمان عورت پر تہمت لگاتا اور چار گواہ نہ لاسکتا تو اسے اسی کوڑے لگائے جاتے تھے، لیکن جب ایک خاوند اپنی بیوی کے بارے میں یہ شکایت رسول کریم ﷺ کی خدمت میں لایا اور اس کے پاس چار گواہ نہ تھے، اب عمومی حکم تو موجود تھا کہ اسے اسی کوڑے مار کر مرد و الشہادہ قرار دے دیا جاتا مگر اللہ تعالیٰ نے اس خصوصی واقعہ کی وجہ سے اپنا عمومی حکم بدل دیا اور آیات لعان نازل فرمادیں۔

اسی طرح نبی کریم ﷺ کی بیویوں کا معاملہ عام عورتوں سے مختلف ہونا تو خود اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بایں الفاظ بیان فرمادیا ہے : ﴿يَسَاءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَأَخِدِ مِنَ النِّسَاءِ﴾ (الاحزاب: ۳۲)

”اے نبی کی بیویوں! تم عام عورتوں میں سے کسی عورت کی طرح نہیں ہو۔۔۔“

جب قرآن کریم سے نبی کریم ﷺ کی بیویوں کے معاملے کا خاص ہونا ثابت ہو گیا ہے تو بھلا سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا پر الزام کے معاملہ میں آپ ﷺ کا پُرانا قانون لاگو نہ فرمانا سمجھ میں نہ آنے والی بات کیسے ہو گئی؟

⑤ عام عورت پر الزام کی صورت میں تہمت لگانے والے پر اسی کوڑوں کی سزا لاگو ہونے کے باوجود لوگوں کے ذہن میں یہ شبہ رہ جاتا ہے کہ شاید تہمت لگانے والا سچا ہو لیکن چار گواہ جمع نہ ہو سکنے کی وجہ سے اس پر حد قائم کر دی گئی ہے، اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی بیویوں کا مقام و مرتبہ اس شک و شبہ سے بلند و بالا بنایا ہے، لہذا سابقہ قانون کو چھوڑ کر خود ان کی براءت نازل کرنا اللہ تعالیٰ کی مشیت تھی، نہ جانے یہ بات منکرین حدیث کی سمجھ میں کیوں نہیں آئی؟

اعتراض نمبر ①: ”بتایا جاتا ہے کہ یہ حضرت ام المؤمنین پر بہتان لگنے کا قصہ غزوہ بنی المصطلق سے واپسی میں پیش آیا تھا، یہ غزوہ شعبان میں ہوا ہے۔ اگر چند روزہ شعبان تک واپسی ہو گئی ہو تھی تو اس داستان کے مطابق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تقریباً نصف رمضان تک بیمار رہیں اور اس پوری مدت میں آپ وحی کے منظر رہے، اس سے لازم آتا ہے کہ تقریباً نصف رمضان تک حضور اکرم ﷺ کی جبرئیل سے ملاقات نہ ہوئی ہو، حالانکہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ ہر سال ماہ رمضان کی ہر شب میں آپ کے پاس حضرت جبرئیل علیہ السلام آ کر قرآن سنتے سناتے تھے، لہذا نہایت سہولت کے ساتھ آپ اس کے متعلق حضرت جبرئیل علیہ السلام سے حقیقت حال معلوم کر سکتے تھے۔“ (مطالعہ: ۱۵۵/۱: ۱۵۶)

جبریل علیہ السلام عالم غیب تھے اور نبی کریم ﷺ جب چاہتے جبریل علیہ السلام کو بلا کر سب حالات دریافت فرما لیتے تھے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جبریل علیہ السلام بلکہ تمام فرشتے مل کر بھی اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر کچھ نہ جانتے تھے، نہ ہی علم ہو جانے کے بعد اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر کسی کو بتانے کے اتھارٹی کسی فرشتے کے پاس تھی، جبریل علیہ السلام سو بار بھی آپ کے پاس آئے ہوں، لیکن اللہ تعالیٰ کی حکمت ہی یہ تھی کہ اصل حقیقت کو دیر سے آشکار کیا جائے، لہذا جبریل علیہ السلام کو پہلے پتہ بھی تھا تو وہ بتانا نہ سکتے تھے، وہ جس کام کے لیے آتے تھے، صرف وہی کرتے تھے، اس دوران کسی اور وحی کا انکار کس نے کیا ہے، صرف سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں اتنے دن وحی نازل نہیں ہوئی، جیسا کہ وہ خود بیان کرتی ہیں: وقد لبث شهرا، لا يوحى اليه في شأني بشئ.

(صحیح بخاری: ۴۱۴۱)

[illegible]

اتفاق کا جو جھوٹا دعویٰ کیا تھا، اس کا تو ہم پول کھول چکے ہیں اور یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے کہ غزوہٴ احزاب بعد میں ہوا تھا، لہذا ان کو اس جھوٹ پر جھوٹ ”فرض“ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں، رہی بات یہ کہ مہاجرین میں سے دو صحابہ اس کام میں شریک ہوئے تھے تو مہاجرین نے وہاں کوئی بات کیوں نہ کی اور رسولِ کریم ﷺ سے محبت کا اظہار کیوں نہ کیا تو اس کا جواب سیدھا سا ہے کہ میرٹھی صاحب خود لکھ چکے ہیں:

”اس کے نتیجے میں مسجد میں شور برپا ہو گیا اور بنی اوس اور بنی خزرج باہم لڑنے مرنے پر آمادہ ہو گئے۔“ (»مطالعہ«: ۱۶۴)

بلکہ صحیح بخاری میں یہ الفاظ بھی ہیں: فشار الحیان الأوس والخزرج حتی هموا ورسول اللہ صَلَّی اللہ علیہ وسلم علی المنبر، فنزل، فحفظہم حتی سکتوا وسکت۔

”اوس اور خزرج دونوں قبیلے بھڑک اٹھے یہاں تک کہ انہوں نے (لڑائی کا) ارادہ کر لیا، رسول کریم صَلَّی اللہ علیہ وسلم منبر پر تھے، آپ نیچے تشریف لائے اور ان کو ٹھنڈا کیا، حتیٰ کہ وہ بھی خاموش ہو گئے اور آپ بھی خاموش ہو گئے۔“ (صحیح بخاری: ۴۱۴)

معلوم ہوا کہ وہاں پہلے ہی شور برپا ہو گیا تھا اور رسول کریم صَلَّی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو خاموش کروا رہے تھے، ایسے حالات میں مہاجرین وہاں رسول کریم صَلَّی اللہ علیہ وسلم کا حکم مان کر خاموش رہ گئے تھے، بھلا وہاں مہاجرین کا نہ بولنا حق رسول کی علامت تھی یا بولنا؟ قارئین ہی فیصلہ فرمائیں کہ اس میں صحیح بخاری کا قصور ہے یا منکرین بخاری کا؟

اعتراض نمبر ۱۲: ”یہاں ناظرین داستانِ اقل کی روایات کے اس اختلاف پر بھی نظر ڈال لیں کہ زہری کی داستان کے مطابق حضرت عائشہ رَضِیَ اللہ عنہا کو اپنے متعلق بہتان کی خبر تقریباً ایک ماہ بعد ہوئی تھی جب بخارا تر گیا تھا اور رات کو مسطح کی ماں کے ساتھ قضائے حاجت سے فارغ ہو کر جنگل سے گھر کی طرف آرہی تھیں۔ ابواسامہ کی داستان میں بھی مسطح کی ماں کو ہی مخبر بتایا گیا ہے، مگر اس میں مذکور ہے کہ قضائے حاجت سے پہلے ہی ام المؤمنین کو مسطح کی ماں نے یہ جانکا ہ اطلاع دے دی تھی، اس کے سنتے ہی ان پر لرزہ طاری ہو گیا اور حاجت کا کوئی احساس ہی نہ رہا، یوں ہی گھر واپس آ گئیں۔۔۔“ (»مطالعہ«: ۱۶۳-۱۶۴)

جواب: ناظرین کو معلوم ہوگا، اگر نہیں تو معلوم ہو جانا چاہیے کہ خود میرٹھی صاحب نے لکھا ہے:

”امام بخاری نے اسے بطور حدیث نہیں بلکہ زہری کی تائید میں تعلقاً ذکر کیا ہے۔۔۔“ (»مطالعہ«: ۱۷۷)

ہمارا سوال ہے کہ جب امام بخاری رَضِیَ اللہ عنہ نے اس کو بطور حدیث پیش ہی نہیں کیا تو صحیح بخاری کی احادیث پر اعتراضات کے ضمن میں اسے پیش کرنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی تھی؟ صحیح بخاری کی معلق روایات ہمارا محلّ نزاع ہیں ہی نہیں، بلکہ امت کا اجماع بخاری کی مرفوع متصل احادیث کی صحت پر ہے۔

معلوم ہوا کہ ابواسامہ کی روایت کو پیش کر کے صحیح بخاری پر اعتراض کرنا محض ہٹ دھرمی ہے، علمی کاوش نہیں۔

اعتراض نمبر ۱۳ : ”دوسرا اختلاف یہ ہے کہ ابواسامہ کی روایت میں تصریح ہے کہ حضور

اکرم ﷺ نے مسجد کے اندر بھرے مجمع سے جب اس قصہ کا ذکر کیا اور جواب میں سعد بن معاذ نے بہتان لگانے والوں کو قتل کر ڈالنے کی اجازت مانگی اور اس کے جواب میں ایک خزر رجبی شخص نے بر بنائے تعصب سعد بن معاذ کی بات کا جواب دیا اور اس کے نتیجہ میں مسجد میں شور برپا ہو گیا اور بنی اوس اور بنی خزر جہاں لڑنے مرنے پر آمادہ ہو گئے تو اس وقت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے گھر ہی تھیں جو بالکل مسجد سے متصل تھا، لیکن ام المؤمنین کو یہ بات بالکل معلوم نہ ہوئی کہ مسجد میں شور کیسا ہے اور کس بات پر لوگ جھگڑ رہے ہیں تو کیا یہ عقل میں آنے والی بات ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے کان میں شور کی آواز نہ پہنچے اور آپ کو اس کی حقیقت جان لینے کا تجسس نہ ہو؟ (»مطالعہ«: ۱۶۴/۸)

(جواب): صحیح بخاری کی حدیث کے مطابق مسجد میں آپ ﷺ کے صحابہ سے بات چیت کرنے

سے پہلے ہی سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو ام مسطح کی زبانی اس واقعہ کا علم ہو چکا تھا، جبکہ مسجد والے واقعہ کے وقت آپ رضی اللہ عنہا اپنے والدین کے گھر تھیں، نیز ایک معلق روایت کی بنا پر صحیح بخاری پر اعتراض کرنا جہالت ہے، کیونکہ معلق روایات صحیح بخاری کے موضوع سے ہی خارج ہیں۔

اعتراض نمبر ۱۴ : ”ابواسامہ کی روایت میں ہے کہ اسی دن شام مسطح کی ماں سے حضرت عائشہ

نے یہ خبر سنی، لیکن زہری کی روایت میں یہ ہے کہ جب حضرت عائشہ مسطح کی ماں سے خبر سن کر آپ سے اجازت لے کر تحقیق حال کے لیے اپنے تو دوسرے دن مسجد میں آپ نے لوگوں سے اس کا ذکر کیا اور سعد بن معاذ و سعد بن عبادہ کے درمیان تلخ کلامی ہوئی، یعنی اس وقت حضرت عائشہ اپنے گھر نہ تھیں، بلکہ والدین کے یہاں تھیں۔

اور ام رومان سے مروی داستان میں یہ مذکور ہے کہ وہ اپنی بیٹی حضرت عائشہ کے پاس حضور اکرم ﷺ کے یہاں گئی ہوئی تھیں کہ ایک انصاریہ عورت آ کر اپنے بیٹے کو کوٹنے لگی۔۔۔ اس روایت کے مطابق حضرت عائشہ کو یہ خبر حضور ﷺ کے گھر میں ہی اپنی ماں کے سامنے ایک انصاری عورت سے معلوم ہوئی تھی، تینوں روایتوں کا یہ اختلاف ناقابل حل ہے اور یہ بجائے خود اس قصہ کے غلط ہونے کی دلیل ہے۔ (»مطالعہ«: ۱۶۵/۸)

(جواب): میرٹھی صاحب نے یہاں صحیح بخاری کی روایات میں تعارض و منافات ثابت کرنے کی

کوشش کی ہے، حالانکہ درحقیقت صحیح احادیث میں کوئی تعارض نہیں ہو سکتا، ہاں! بسا اوقات ظاہری طور پر کسی کو کوئی منافات نظر آتی ہے، حقیقت اس کے برعکس ہوتی ہے اور ایسا تو کئی قرآنی آیات میں بھی ہے، بھلا اس وجہ

سے قرآنی آیات پر بھی اعتراض کیا جائے گا؟

ابو اسامہ کی روایت تو ہے ہی معلق، لہذا اس پر اعتراض فضول ہے، رہی بات امام زہری رحمہ اللہ کی روایت کی کہ اس میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے والدین کے گھر جانے کے بعد دوسرے دن مسجد میں رسول کریم ﷺ کے خطاب کا ذکر ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ مسجد والا معاملہ خود نہیں سنا، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے والدین کے گھر سے فوراً واپس آ گئی تھیں، جیسا کہ خود میرٹھی صاحب نے لکھا ہے:

”جب حضرت عائشہ اپنے والد کے یہاں پہنچیں تو حضرت ابو بکر نے انہیں واپس جانے کی سخت تاکید کی، وہ حضور ﷺ کے یہاں اپنے گھر میں واپس آ گئیں، دوسرے دن صبح کو ابو بکر و ام رومان دونوں ان کے یہاں پہنچ گئے اور شام تک وہیں رہے۔۔۔“ (»مطالعہ«: ۱۱۶/۱-۱۶۷)

یہ اعتراض تو ان کے گھر سے ہی رفع ہو گیا ہے، رہا معاملہ یہ کہ ایک روایت میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو ام سطح کی طرف سے گھر سے باہر اطلاع ملنے کا ذکر ہے اور دوسری روایت میں یہ ذکر ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی والدہ رسول کریم ﷺ کے گھر میں موجود تھیں کہ انصار کی ایک عورت نے آ کر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو اطلاع دی، اس تعارض کا حل کرتے ہوئے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وطريق الجمع بينهما أنها سمعت ذلك أولاً من أم مسطح ، ثم ذهبت إلى بيت أمها لتستيقن الخبر منها ، فأخبرتها أمها بالأمر مجملًا ثم دخلت الأنصارية ، فأخبرتها بمثل ذلك بحضرة أمها ، فقوى عندها القطع بوقوع ذلك ، فسألت هل سمعه أبوها وزوجها ترجيا منها أن لا يكونا سمعا ذلك ، ليكون أسهل عليها ، فلمّا قالت لها : أنّهما سمعا ، غشى عليها ”دونوں روایات میں تطبیق یہ ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے پہلے یہ خبر ام سطح سے سنی، پھر وہ اس کی تصدیق کے لیے اپنی والدہ کے پاس چلی گئیں، انہوں نے مختصر انداز سے بات بتائی، پھر جب انصار کی ایک عورت نے ان کی والدہ کی موجودگی میں آ کر یہ خبر دی تو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس واقعہ کا قطعی یقین ہو گیا، پھر انہوں نے اس عورت سے پوچھا، کیا ان کے والد (سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ) اور خاوند (رسول کریم ﷺ) نے بھی یہ خبر سنی ہے؟ آپ کو امید یہ تھی کہ ان کو یہ خبر نہیں پہنچی ہوگی، لہذا یہ معاملہ خفیف ہوگا، لیکن جب عورت نے بتایا کہ انہوں نے بھی یہ بات سنی ہے تو (پریشانی کی وجہ سے) آپ پر غشی طاری ہو گئی۔۔۔“

کتنی واضح سی بات ہے جو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے سمجھا دی ہے، عام آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ یہ خبر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو کئی ذرائع سے ملی، جب ایک عام عورت نے خبر دی اور یہ بھی بتا دیا کہ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور رسول کریم ﷺ کو بھی یہ بات پہنچ گئی ہے تو آپ فرط غم سے بے ہوش ہو گئیں، اس میں بھلا عقلی طور پر کون سی خرابی اور کون سا تعارض ہے جو ناقابل حل ہے؟ اگر کوئی آدمی حق کو تسلیم نہ کرنے کی ٹھان لے تو بھلا قرآن کریم میں ایک ایک واقعہ میں اسے تعارض نظر نہیں آئے گا؟ ایک مثال پیش خدمت ہے:

سورہ ق میں فرمان باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُغُوبٍ﴾ (ق: ۳۸) ”اور یقیناً ہم نے آسمانوں، زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، اسے چھ دنوں میں پیدا کیا اور ہمیں کوئی تھکاوٹ بھی نہیں ہوئی۔“

جبکہ سورہ حم السجدہ میں یوں فرمان ہے: ﴿قُلْ أَعْيُنُكُمْ لَنْ كُفِّرُنَّ بِاللَّذِي خَلَقَ الْأَرْضَ فِي يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُونَ لَهُ أَندَادًا ذَلِكَ رَبُّ الْعَالَمِينَ﴾ وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبَارَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ سَوَاءً لِلنَّاسِ لَيْنٌ ﴿ثُمَّ اسْتَوَى إِلَى السَّمَاءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ﴾ فَقَضَاهُنَّ سَبْعَ سَمَوَاتٍ فِي يَوْمَيْنِ... (حم السجدہ: ۹-۱۲)

”(اے نبی!) کہہ دیجئے، کیا تم اس ذات کے ساتھ کفر کرتے ہو جس نے زمین کو دو دنوں میں پیدا فرمایا اور تم اس کے لیے شریک ٹھہراتے ہو، وہ تو سب جہانوں کا رب ہے، اور اس نے اس (زمین) میں اس کے اوپر پہاڑ بنائے اور اس نے اس میں برکت دی اور اس نے اندازہ رکھا اس میں اس کی غذاؤں کا چار دنوں میں، سوال کرنے والوں کے لیے یہ برابر ہے، پھر اس نے آسمان کی طرف توجہ کی، اس حال میں کہ وہ دھواں تھا، چنانچہ اس نے آسمان اور زمین کو کہا کہ تم دونوں خوشی یا ناخوشی آؤ، دونوں نے کہا، ہم خوشی سے آتے ہیں، پس اس نے دو دنوں میں سات آسمان بنائے۔۔۔“

اب پہلے مقام پر اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان اور جو کچھ ان میں ہے، سب کو چھ دنوں میں پیدا کرنے کا تذکرہ فرمایا ہے، جبکہ دوسرے مقام پر دو دنوں میں زمین، چار دنوں میں زمین کی اندرونی چیزوں اور دو دنوں میں آسمانوں کو بنانے کا تذکرہ کیا ہے، یوں ظاہراً آٹھ دن بنتے ہیں، کیا کوئی عقل مند انسان کہہ سکتا ہے کہ (معاذ اللہ!) یہ ناقابل حل اختلاف ہے؟

ظاہر ہے کہ اگر آدمی اسے حق تسلیم کرے تو اپنی عقل کا تصور سمجھے گا اور کوئی نہ کوئی توجیہ کر کے ضرور اسے

قبول کر لے گا، لیکن اگر وہ اس حق کا مخالف و منکر ہوا تو اسے یہی بات اقرار حق میں رکاوٹ نظر آئے گی، بعینہ یہی معاملہ حدیث کا ہے، جب اس کے راویوں اور سندوں پر آنے والے تمام اشکالات رفع کر دیئے گئے ہیں تو صرف اپنی عقلِ نارسا کو معیار قرار دے کر ٹھکرانا تعصب کے سوا کچھ نہیں۔

اعتراض نمبر ۱۵ : ”پس زہری کی روایت کے مطابق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ان

کے والدین اور ایک انصاری عورت کی موجودگی میں حضرت ابوبکر کے گھر یہ آیات نازل ہوئیں۔

لیکن ابواسامہ کی داستان میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے والد کے یہاں پہنچیں تو حضرت ابوبکر نے انہیں واپس جانے کی سخت تاکید کی، وہ حضور ﷺ کے یہاں اپنے گھر واپس آ گئیں، دوسرے دن صبح کو ابوبکر و ام رومان دونوں ان کے یہاں پہنچ گئے اور شام تک وہیں رہے، عصر کی نماز پڑھ کر حضور اکرم ﷺ گھر تشریف لائے۔۔۔۔۔ پس ابواسامہ کی روایت کے مطابق یہ آیات خود حضور اکرم ﷺ کے گھر اتریں تھیں اور ام المؤمنین وہیں ابوبکر کے یہاں سے واپس آ گئیں تھیں اور ان کے والدین ابوبکر و ام رومان بھی موجود تھے۔

لیکن ام رومان والی روایت میں مذکور ہے کہ انصاریہ عورت سے بہتان کی خبر سن کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بے ہوش ہو کر گر گئیں، ہوش آیا تو انہیں سخت جاڑا بخار تھا۔۔۔۔۔ حضور اکرم ﷺ یہ سن کر باہر تشریف لے گئے، تھوڑی دیر بعد ابوبکر کے ساتھ واپس آئے اور اللہ کی طرف سے ام المؤمنین کی بے گناہی کی صراحت آ جانے کی بشارت دی، پس اس روایت کے مطابق یہ آیات حضرت عائشہ و ام رومان کے سامنے نہیں، بلکہ گھر سے باہر نازل ہوئیں۔

بتائے تینوں روایتوں کے مضمون کے اس تضاد کو کیسے رفع کیا جائے؟ اگر تین شخص بجائے خود نہایت ثقہ ہوں اور وہ کسی امر کے بارے میں گواہی دیں، لیکن تینوں کا بیان باہم متضاد ہو تو کیا ان کی وہ شہادت قابل قبول ہوگی؟ ہرگز نہیں، اختلاف و تناقض کی وجہ سے تینوں کی شہادت رد کر دی جائے گی، اسی طرح یہ تینوں روایتیں گو صحیح بخاری میں درج ہیں، لیکن جب ایک ہی واقعہ کے متعلق ان کے مضامین میں باہم اس قدر اختلاف و تناقض ہے تو مقتضائے عقل یہی ہے کہ تینوں روایتیں رد کر دی جائیں اور باور کیا جائے کہ یہ افسانہ سرے سے

غلط ہے۔۔۔“ (مطالعہ: ۱۶۶/۸-۱۶۸)

جواب : ① فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿فَيَوْمَئِذٍ لَا يُسْأَلُ عَنْ ذَنْبِهِ إِنْسٌ وَلَا جَانٌّ﴾ (الرحمن: ۳۹)

”اس (قیامت کے) دن کسی انسان اور جن سے اس کے گناہ کے بارے میں پوچھا نہیں جائے گا۔“

ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ مَاذَا أَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِينَ﴾ (القصص: ۶۵)

”اور وہ (اللہ تعالیٰ) ان کو پکارے گا اور فرمائے گا، تم نے میرے رسولوں کو کیا جواب دیا تھا؟“

کیا (معاذ اللہ!) ان فرامین باری تعالیٰ کے بارے میں کہا جائے گا کہ ”بتائیے ان آیات کے مضمون کے اس تضاد کو کیسے رفع کیا جائے؟ جب ایک ہی واقعہ کے متعلق ان کے مضامین میں باہم اس قدر اختلاف و تناقض ہے تو مقتضائے عقل یہی ہے کہ دونوں کو رد کر دیا جائے اور باور کیا جائے کہ یہ افسانہ سرے سے غلط ہے۔۔۔“ کیونکہ ایک آیت میں مذکور ہے کہ قیامت کے روز کسی انس و جن سے اس کے گناہوں کے بارے میں پوچھا ہی نہیں جائے گا، بلکہ ویسے ہی سزا لگا کر دی جائے گی، جبکہ دوسری کئی آیات میں ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ کافروں اور اپنے انبیاء کے نافرمانوں سے پوچھے گا۔

جب قرآن کے بارے میں یہ نظریہ ہے کہ اس میں کوئی تعارض نہیں، اگر کہیں ایسی بات نظر آئے تو انسانی عقل کا قصور ہے تو حدیث نبوی کو اس طرح کے حیلے بہانوں سے کیوں چھوڑا جاتا ہے؟ حالانکہ قرآن کی طرح نبی کریم ﷺ کے اقوال و افعال پر بھی عمل ضروری ہے، کیونکہ فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب: ۲۱)

”تمہارے لیے اللہ کے رسول (کی زندگی) میں اچھا نمونہ ہے۔“

کیا آپ ﷺ کی زندگی کا یہ واقعہ ہمارے لیے اسوۂ حسنہ نہیں، پھر اس کو ٹھکرانے کی کوئی معقول وجہ بھی نہیں ہے، محض عقل کو معیار بنا کر حدیث رسول اور اجماع امت کا انکار کر کے خیر القرون سے لے کر اب تک کے تمام مسلمانوں کو بے عقل و بے شعور قرار دینے کی مذموم سعی کی جا رہی ہے، کیا تمام سلف صالحین اتنا بھی شعور نہیں رکھتے تھے کہ (معاذ اللہ!) ایک جھوٹے افسانے کو عقیدے و عمل میں بنیادی حیثیت دیتے رہے؟

② یہ کہنا کہ زہری کی روایت میں ذکر ہے کہ آیات براءت سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گھر میں نازل ہوئیں، بالکل خلاف واقعہ بات ہے، کوئی منکر حدیث ہمت کر کے امام زہری کی روایت میں یہ بات دکھائے تو سہی، اصل بات وہی ہے جو ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا جب واقعہ اُفک کی تحقیق کرنے اپنے والدین کے گھر گئی تھیں تو اپنی والدہ سے پوچھ کر فوراً واپس آگئی تھیں، جیسا کہ زہری اور ابواسامہ دونوں کی روایت میں ہے: وَأَصْبَحَ أَبُوای عِنْدِي . ”صبح کے وقت میرے والدین میرے پاس آ گئے۔“

اگر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا ہری کی روایت کے مطابق والدین کے گھر میں ہی تھیں تو پھر ان کے یہ کہنے کا کیا مطلب ہوا کہ میرے والدین صبح کے وقت میرے پاس آئے؟

رہا امّ رومان رضی اللہ عنہا والی روایت کے بارے میں میرٹھی صاحب کا یہ کہنا کہ ”حضور اکرم ﷺ یہ سن کر باہر تشریف لے گئے، تھوڑی دیر بعد ابو بکر کے ساتھ واپس آئے۔۔۔ پس اس روایت کے مطابق یہ آیات حضرت عائشہ و امّ رومان کے سامنے نہیں بلکہ گھر سے باہر نازل ہوئیں۔۔۔“

تو یہ زبردست علمی خیانت ہے، ہے کوئی منکر حدیث جو اس خیانت کو دیانت ثابت کرتے ہوئے اس واقعہ کے تحت صحیح بخاری میں سے رسول اکرم ﷺ کا باہر جانا، پھر سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ واپس آنا اور راستے میں آیات براءت کا نازل ہونا دکھا کر اپنے میرٹھی صاحب کی عزت بچالے؟

معلوم ہوا کہ صحیح بخاری کی اس روایت میں بھی باقی دونوں روایات کی طرح رسول کریم ﷺ کے گھر میں ہی ان آیات کے نزول کا تذکرہ ہے، نیز یہ تمام اعتراضات نیک نیتی اور دین فہمی کی غرض سے نہیں، بلکہ حدیث و محدثین دشمنی کے نظریے سے کیے گئے ہیں، کیونکہ جھوٹ تو جھوٹے لوگ ہی بولتے ہیں؟

رہے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے یہ الفاظ : وانصرف ولم يقل شيئاً ، فأنزل الله عذري ...

”آپ ﷺ پھرے اور کچھ نہیں کہا، پھر اللہ تعالیٰ نے میری براءت نازل فرمادی۔۔۔“

تو انصرف کا معنی ہر وقت کسی جگہ سے نکلنا نہیں، بلکہ اکثر اس کا معنی توجہ ہٹا کر دوسری طرف کرنا بھی ہوتا ہے، جیسا کہ صحیح بخاری کے مطالعہ سے ہی بیسیوں مقامات مل سکتے ہیں، بطور نمونہ ایک ملاحظہ فرمائیں:

عن عائشة رضی اللہ عنہا أنّ النبی صلی اللہ علیہ وسلم صلی فی خمیصة لها أعلام ، فلمّا انصرف قال : اذهبوا بخمیصتی هذه ... فانّها ألهمتني أنفا عن صلاتی ...

”سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے دھاری دار چادر میں نماز پڑھی، جب آپ نماز سے پھیرے تو فرمایا، میری یہ چادر لے جاؤ۔۔۔ کیونکہ اس نے مجھے ابھی نماز سے غافل کر دیا تھا۔۔۔“

(صحیح بخاری: ۳۷۳)

کیا یہاں کوئی انصرف کا معنی یہ کر سکتا ہے کہ ”جب آپ گھر سے باہر تشریف لے گئے تو فرمایا“؟ صاف صاف بات ہے کہ یہاں اس کا معنی نماز سے توجہ ختم کر کے گھر والوں کی طرف توجہ مبذول کرنا ہے اور یہی معنی سیدہ امّ رومان رضی اللہ عنہا والی حدیث افک میں ہے جس کو سمجھنے کی بجائے میرٹھی صاحب نے اس

واقعی واقعہ کو ”سرے سے غلط افسانہ“ قرار دے دیا ہے۔

اعتراض نمبر ۱۶ : ”زہری وابو اسامہ دونوں کی روایت میں مذکور ہے کہ حضرت

ام المؤمنین پر بہتان لگانے کی سرپرستی تو منافق اعظم عبداللہ بن اُبی کر رہا تھا اور مخلص مؤمنین میں سے بھی تین شخص اس گناہ کا ارتکاب کر بیٹھے تھے، ایک مشہور شاعر حضرت حسان بن ثابت انصاری خزرجی، دوم مسطح بن اثاثہ مہاجر بدری جو خاندان بنی مطلب میں سے تھا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خالہ زاد بہن کا بیٹا تھا اور غریب ہونے کی وجہ سے حضرت ابوبکر اس کی مالی امداد فرماتے رہتے تھے، اس نے بھی ام المؤمنین پر یہ ظلم کیا تو حضرت ابوبکر نے آئندہ کے لیے اس کی مالی مدد کرنے سے ہاتھ کھینچ لیے تھے، سوم حمہ بنت جحش مہاجرہ صحابیہ۔ ان تینوں نے کھل کر حضرت ام المؤمنین پر بہتان لگایا تھا اور محمد بن اسحاق مؤرخ کی روایت جس کی تخریج ابوداؤد نے کی ہے، یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ان تینوں پر حدِ قذف جاری فرمائی۔

میں کہتا ہوں حقیقت یہ ہے کہ نہ حسان بن ثابت نے یہ جرم کیا تھا نہ مسطح بن اثاثہ نے نہ حمہ نے، یہ ان پر دشمنوں کا بہتان ہی بہتان ہے جیسا کہ میں آگے چل کر وضاحت کے ساتھ ثابت کروں گا، یہاں میں یہ بتانے پر اکتفا کرتا ہوں کہ سورۃ احزاب سورۃ النور سے بہ اتفاق مفسرین پہلے نازل ہوئی ہے اور سورۃ احزاب میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو صراحت کے ساتھ بتا دیا تھا کہ ازواجِ مطہرات کا حکم و مرتبہ عام مؤمن عورتوں سے بہت مختلف اور نہایت بلند ہے، حضور اکرم ﷺ کی ہر بیوی تمام مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں کی ماں ہے۔۔۔ اور انہیں خوب فہمائش کر دی گئی تھی کہ رسول اللہ ﷺ کو اذیت دینا خود اللہ کو اذیت دینے کے معنی میں ہے، ایسے شخص پر دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے اور اس کے لیے ذلیل و رسوا کر دینے والا عذاب طے ہے۔۔۔ ان تصریحات کے ہوتے ہوئے کس مسلمان کی یہ مجال ہو سکتی تھی کہ حضرت ام المؤمنین پر بہتان باندھ کر رسول اللہ ﷺ کو اذیت پہنچائے، کسی شریف و پارسا مسلمان عورت پر بہتان باندھنا گناہِ کبیرہ اور موجبِ حدِ قذف ہے، لیکن حضور ﷺ کی بیوی پر بہتان باندھنا کفر اور موجبِ لعنت ہے، سخت حیرت کی بات ہے کہ حسان بن ثابت و مسطح بن اثاثہ و حمہ بنت جحش کو مؤمن و مخلص بھی بتایا جائے اور ان کے متعلق یہ بھی باور کر لیا جائے کہ انہوں نے حضور اکرم ﷺ کی چہیتی بیوی پر بہتان باندھ کر وہ گناہ کر لیا ہوگا جو رسول اللہ ﷺ کے کسی دشمن سے دشمنِ مشرک یا یہودی نے بھی نہیں کیا، اگر کوئی شریف بیٹی اپنی شریف و پاکیزہ ماں پر بہتان لگا سکتی ہو تو حمہ بنت جحش نے بھی لگا دیا ہوگا اور کوئی شریف بیٹا اپنی شریف ماں کو رسوا کرنے پر قتل سکتا

ہو تو حسان اور مسطح نے بھی اس کا ارتکاب کر لیا ہوگا۔۔۔“ (»مطالعہ«: ۱۶۸-۱۶۹)

(جواب) : ① قارئین کرام! ہم تو اس ادیبانہ کاوش پر بعد میں تبصرہ کریں گے، آپ ذرا وہ

عبارت پہلے پڑھ لیں جو حق کو واضح کرنے کے لیے خود میرٹھی صاحب کی قلم سے اللہ تعالیٰ نے نکلا دی ہے:

”ہاں یہ بات واضح ہنی چاہیے کہ حضرت حسان شاعر تھے، شاعر دوسروں کی بہ نسبت زیادہ ذکی الحس

ہوتا ہے اور معمولی سی بات کو بڑی اہمیت دے ڈالتا ہے، جب منافقین نے چند پارساموں عورتوں کے خلاف

طوفانِ افک اٹھایا تھا تو اس موقع پر حضرت حسان سے بھی ان کی ہمنوائی کی غلطی ہوگئی تھی، یعنی حسان بھی کسی

پارساموں عورت کو بے ثبوت مطعون کر بیٹھے، اس کی سزائیں ان پر حدِ قذف نافذ ہوئی، وہ کون عورت تھی؟ نہ

ہم اسے جانتے ہیں نہ اس کے جاننے سے کچھ حاصل۔۔۔“ (»مطالعہ«: ۱۸۳)

سبحان اللہ! تیری زلف میں پہنچی تو حسن کہلائی وہ تیرگی جو میرے نامہ سیاہ میں تھی

حدیثِ افک میں سیدنا حسان رضی اللہ عنہ کا تہمت لگانے والوں میں شامل ہونا میرٹھی صاحب کو شانِ صحابیت کے سخت

خلاف معلوم ہوا تھا، لیکن جب خود اسی صحابی کو ایک پاکدامن مومنہ عورت پر تہمت لگانے میں ملوث کیا تو اس سے نہ تو

صحابیت میں کچھ فرق پڑا نہ بے گناہ پاکدامن عورت پر تہمت لگانے کے سلسلے میں قرآنی وعیدوں میں سے کسی پر نظر پڑی۔

فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّ الَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ الْغَافِلَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ لَعُنُوا فِي الدُّنْيَا

وَالْآخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ (النور: ۲۳)

”بلاشبہ وہ لوگ جو پاکدامن، بھولی، بھالی، مومن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں، وہ دنیا و آخرت میں لعنت

کیے گئے ہیں اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔“

﴿وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوهُمْ ثَمَانِينَ جَلْدَةً وَلَا تَقْبَلُوا

لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا وَأُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ﴾ (النور: ۴)

”اور جو لوگ پاکدامن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں، پھر چار گواہ نہیں لاتے، ان کو اسٹی کوڑے لگاؤ اور ان

کی گواہی کبھی بھی قبول نہ کرو اور یہی لوگ فاسق ہیں۔“

یاد رہے کہ میرٹھی صاحب نے صرف ازواجِ مطہرات پر تہمت لگانے والے کو موجبِ لعنت ٹھہرایا ہے،

جبکہ قرآن کریم کی زبانی عام مومن پاکدامن عورت پر تہمت لگانے والا بھی دنیا و آخرت میں لعنتی ہے۔

اب اگر کوئی آدمی میرٹھی صاحب سے بھی دو قدم آگے نکل کر کہہ دے کہ صحابی رسول سیدنا حسان رضی اللہ عنہ کی

نے کسی بھی پاکدامن عورت پر بہتان نہیں لگایا، ایسی باتیں محض افسانہ و جھوٹ ہیں اور تھوڑے بہت تصرف کے ساتھ میرٹھی صاحب والی گردان پڑھتے ہوئے وہ یہ کہہ دے کہ ”ان تصریحات کے ہوتے ہوئے کس مسلمان کی یہ مجال ہو سکتی ہے کہ وہ کسی شریف و پاکدامن عورت پر بہتان لگا کر دنیا و آخرت میں لعنت کا مستحق ہو اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مردود الشہادہ اور فاسق قرار پائے؟“

نیز وہ تھوڑے سے تغیر کے ساتھ میرٹھی صاحب کے یہ الفاظ بھی نقل کر دے کہ ”سخت حیرت و تعجب کی بات ہے حسان بن ثابت کو مؤمن و مخلص بھی بتایا جائے اور ان کے متعلق یہ بھی باور کر لیا جائے کہ انہوں نے ایک پاکدامن مؤمن عورت پر بہتان باندھ کر بالکل وہی گناہ کر لیا تھا جس میں صرف بڑے بڑے دشمنان اسلام منافقین ہی ملوث ہوئے تھے!“

اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی کہے کہ ”اگر کوئی غیرت مند اور شریف بھائی اپنی شریف و پاکیزہ بہن کو رسوا کرنے پر تل سکتا ہو تو حسان نے بھی اپنی اسلامی بہن کے خلاف اس جرم کا ارتکاب کر لیا ہوگا!“

مزید برآں وہ جنگِ جمل کی صورت میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی لڑائی کا بھی ذکر کرے جس کے ابھی تک میرٹھی صاحب بھی اقراری ہیں ((مطالعہ: ۸۸۰/۱)) (آنے والے دنوں میں شاید یہ واقعہ بھی ان کی عقل میں نہ سمائے اور وہ اسے بھی جھوٹا افسانہ قرار دے دیں!)، پھر وہ یوں عبارت بنائے کہ ”سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا مؤمنوں کی ماں ہیں، والدین کو تو قرآن نے اُف بھی کہنے سے منع کر دیا ہے اور رسول کریم ﷺ کا فرمان ہے کہ والدین کی رضا میں اللہ کی رضا اور والدین کی ناراضی میں اللہ کی ناراضی ہے، کوئی شریف و مؤمن بیٹا تو اپنی والدہ کو اس کی زیادتی کے باوجود اُف تک بھی نہیں کہہ سکتا، حیرت و تعجب کی بات ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو مؤمن و مخلص بھی بتایا جائے اور ان کے متعلق یہ بھی باور کر لیا جائے کہ انہوں نے اس ہستی کے خلاف سرعام بازارِ جنگ گرم کر لیا تھا جس کو قرآن نے سب مؤمنوں کی ماں کہا ہے، اگر کوئی حلال زادہ اور شریف بیٹا اپنی ماں کو علی الاعلان رسوا کرنے پر تل سکتا ہو تو مان لیں گے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے بھی اس کا ارتکاب کر لیا ہوگا!“

تو میرٹھی صاحب کے پاس اس کا کیا جواب ہے؟ جو جواب وہ اس سوال کا دیں گے، وہی ہماری طرف سے واقعہ آفک میں کیے گئے اپنے اعتراض کا سمجھ لیں۔

⑤ جس بات کو ماننے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں، وہ یہ ہے کہ انسان ہونے کے ناطے کچھ مسلمان بھی منافقین کی باتوں میں آگئے اور ان کی ہمنوائی کی غلطی ان سے ہوگئی، جس کو اللہ تعالیٰ نے معاف بھی کر دیا،

خود سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اس واقعہ کے بعد بھی سیدنا حسان رضی اللہ عنہ کو سچا پکا مسلمان سمجھتی تھیں اور ان کو برا بھلا کہنے کی اجازت نہیں دیتی تھیں، بلکہ ایسا کرنے والے کو ان کے مخلص و مؤمن ہونے کی دلیل کے طور پر رسول کریم ﷺ اور اسلام کے دفاع میں ان کے اشعار سناتیں۔ (صحیح بخاری: ۴۴۱)

رہا یہ سوال کہ نبی اکرم ﷺ کو ایذا دینے والے کے لیے دنیا و آخرت میں لعنت کی وعید سنائی گئی ہے تو پھر سیدنا حسان اور دوسرے اشخاص جو اس واقعہ میں ملوث ہوئے تھے، ان کو ہم مخلص و مؤمن کیسے سمجھتے ہیں؟ اس کا جواب وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے جھوٹی تہمت لگانے والوں کی سزایان کرتے ہوئے سورہ نور میں ہی دے دیا ہے، فرمایا: ﴿إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ وَأَصْلَحُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾ ”ہاں! جو لوگ اس کے بعد توبہ کر لیں اور اصلاح کر لیں تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ بہت زیادہ معاف کرنے والا نہایت مہربان ہے۔“

پھر اس بات پر سب مسلمانوں کا جماع بھی ہے کہ سب صحابہ جنتی ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی زندگی میں ہی ان سے راضی ہو گیا تھا، اتنی سی بات تھی جس کے سمجھ میں نہ آنے نے میرٹھی صاحب کو انکار حدیث پر اکسا دیا! جاری ہے۔۔۔



قرض سے نجات اور حرام سے بچنے کی دعا

ابن نذیر نور پوری

رسول اللہ ﷺ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو یہ کلمات سکھلائے:

اللَّهُمَّ اكْفِنِي بِحَلَالِكَ عَنْ حَرَامِكَ وَأَغْنِنِي بِفَضْلِكَ عَمَّنْ سِوَاكَ.

”اے اللہ! تو مجھے اپنی حلال کردہ اشیاء کیساتھ حرام اشیاء سے کافی ہو جا اور اپنے فضل کیساتھ اپنے علاوہ

ہر ایک سے بے نیاز کر دے۔“ (جامع ترمذی: ۳۵۶۳، مسند الامام احمد: ۱۵۳/۱، المستدرک للحاکم: ۷۲۷/۱، المختارة للضیاء المقدسی: ۴۹۰، وسندہ حسن)

تنبیہ:

عبدالرحمن بن اسحاق الراوی عن سیار ابی الحکم، ہو عبدالرحمن بن اسحاق المدنی

القرشی، لا الکوفی، کما ہو مصرح فی روایۃ أحمد والحاکم والمختارة، ولا یغتر أحد بترجمة الکوفی فی «تہذیب الکمال» حیث ذکر فی شیوخہ سیار أبو الحکم والراوی عنہ أبو معاویۃ ایضاً موجود، لكن لو رجع راجع الی «الرحر والتعدیل» لابن أبی حاتم لوجد عکس ذلك حیث ذکر سیار أبو الحکم فی شیوخ الأنصاری القرشی المدنی، لا الواسطی الکوفی، وكذلك الراوی عنہ أبو معاویۃ ذکر فی ترجمة المدنی، لا الکوفی، فوهم الحافظ المزی فی ترجمة المدنی والکوفی، فافهم وتدبر!



فطرانہ ادا کرنا فرض ہے، جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: ”رسول اللہ ﷺ نے (رمضان المبارک میں) مسلمانوں کے غلام، آزاد، مرد، عورت، چھوٹے اور بڑے پر ایک صاع کھجور یا جو فطرانہ فرض قرار دیا ہے۔“ (صحیح بخاری: ۱۵۰۳، صحیح مسلم: ۹۸۴)

ثابت ہوا کہ مسلمان غلام پر فطرانہ فرض ہے، نہ کہ کافر پر، اگر کوئی کہے کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لیس فی العبد صدقة الا صدقة الفطر .
 ”غلام پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے، مگر صدقۃ فطر (واجب) ہے۔“ (صحیح مسلم: ۹۸۲)
 اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث عام ہے اور مذکورہ بالا حدیث ابن عمر خاص ہے، خاص کو عام پر مقدم کیا جاتا ہے۔

فائدہ: ① حجازی صاع دوسیر چار چھٹانک کا ہوتا ہے، اس کا اعشاری وزن 2.099 بنتا ہے۔

② سیدنا قیس بن سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: أمرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بصدقة الفطر قبل أن تنزل الزكاة ، فلما نزلت الزكاة لم يأمرنا ولم ينهنا ، ونحن نفعله . ”زکوٰۃ کا حکم نازل ہونے سے پہلے ہمیں رسول اللہ ﷺ نے صدقۃ فطر ادا کرنے کا حکم دیا، جب زکوٰۃ کا حکم نازل ہو گیا تو آپ ﷺ نے نہ ہمیں حکم دیا اور نہ ہی منع فرمایا، البتہ ہم اسے ادا کرتے تھے۔“
 (مسند الامام احمد: ۶/۶، سنن النسائی: ۲۵۰۹، سنن ابن ماجہ: ۱۸۲۸، السنن الكبرى للبيهقي: ۱۵۹/۴، وسنده صحيح)
 اس حدیث کو امام ابن خزیمہ (۲۳۹۴) رحمہ اللہ اور امام حاکم (۴۱/۱) رحمہ اللہ نے ”صحیح“ کہا ہے، حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے ان کی موافقت کی ہے۔

حافظ خطابی رحمہ اللہ اس حدیث کے تحت لکھتے ہیں:

وهذا لا يدل على زوال وجوبها ، وذلك أن الزيادة في جنس العباد لا يوجب نسخ الأصل المزيّد عليه ، غير أنّ محلّ الزكوات الأموال ومحلّ زكاة الفطر الرقاب .

”یہ حدیث صدقہ فطر کے وجوب کے ختم ہونے پر دلالت نہیں کرتی، کیونکہ عبادت کی جنس میں زیادت اصل کے منسوخ ہونے کو واجب نہیں کرتی، نیز (ایک فرق یہ بھی ہے کہ) زکوٰۃ مالوں پر فرض ہوتی ہے اور صدقہ فطر جانوں پر۔“ (معالم السنن: ۲/۲۱۴)

③ خوراک کی جو جنس استعمال میں آتی ہے، مثلاً گندم، جو، کھجور، پنیر، کشمش وغیرہ، بہتر تو یہ ہے کہ اس میں سے فی کس ایک صاع فطرانہ ادا کیا جائے، ہاں! یاد رہے کہ روپے پیسے یا چاندی وغیرہ کی صورت میں بھی فطرانہ ادا کیا جاسکتا ہے۔

④ امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: لیس بہ بأس أن يعطى زكاة رمضان فضة .
”صدقہ فطر چاندی کی صورت میں ادا کرنے میں کوئی حرج والی بات نہیں۔“

(تاریخ ابن معین: ۲۳۲۶، ۲۷۶۵)

⑤ صدقہ فطر نماز عید سے پہلے ادا کیا جائے، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فطرانہ روزہ دار کی لغویات اور فحش گوئی سے روزہ کو پاک کرنے کے لیے اور مساکین کو کھانا کھلانے کے لیے فرض کیا ہے، جو اسے نماز عید سے پہلے ادا کر دے، اس کی طرف سے قبول ہوگا اور جو نماز عید کے بعد ادا کرے گا، وہ عام صدقات میں سے ایک عام صدقہ ہے۔“

(سنن ابی داؤد: ۱۶۰۹، سنن ابن ماجہ: ۱۸۲۸، وسندہ حسن)

اس حدیث کو امام حاکم رحمہ اللہ نے ”صحیح“ کہا ہے، حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے ان کی موافقت کی ہے۔

⑥ صدقہ فطر عید سے ایک دو دن پہلے بھی ادا کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ امام ایوب سختیانی رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں، میں نے نافع سے پوچھا کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کب صاع ادا کرتے تھے تو نافع رحمہ اللہ نے کہا، جب عامل (صدقہ وصول کرنے والا) بیٹھ جاتا، میں نے کہا، وہ کب بیٹھتا تھا؟ نافع رحمہ اللہ نے فرمایا، عید الفطر سے ایک دو دن پہلے بیٹھتا تھا۔“ (صحیح ابن خزيمة: ۲۳۹۷، وسندہ صحیح)

⑦ خوب یاد رہے کہ فطرانہ صرف مساکین کا حق ہے۔

(مجموع الفتاوی لابن تیمیہ: ۷۲۵-۷۲۸، زاد المعاد لابن القيم: ۴۴/۲)

یہ سلفی العقیدہ، متشرع اور نمازی مسلمانوں کا حق ہے، اہل حق کے دینی مدارس پر بھی خرچ کیا جاسکتا ہے، بد قسمتی سے ہمارے ہاں مسلمانوں کا قیمتی مال دین کے نام پر ”سرکاری“ تنظیمیں، تحریکیں کھاجاتی ہیں، مستحقین

محروم رہ جاتے ہیں۔

⑥ فطرانہ کا مقصد دورانِ روزہ ہونے والی کمی کو تاحی کی معافی، بے فائدہ اور فحش کلامی کی تطہیر اور عید کے دن باوقار طریقے سے مساکین کو در بھر ٹھو کریں کھانے سے بچانا ہے، فطرانہ شکرانہ کی بہترین اور بے مثال صورت ہے، اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کا باعث ہے، گھر میں خیر و برکت اور امن و سکون کا باعث ہے، ہر قسم کی برائی اور شر سے بچنے کا محفوظ راستہ ہے، اس سے باہمی مودت و رحمت جنم لیتی ہے، نفرتوں اور کدورتوں کا قلع قمع ہوتا ہے، انسانی ہمدردی کا شاندار مظاہرہ ہوتا ہے اور باوقار معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔

دعا ہے کہ اللہ رب العزت ہمارے گناہوں کو معاف کر کے ہمیں اپنے صالحین بندوں میں شامل فرمائے۔ آمین!



بوڑھے آدمی کا روزہ

اس بات پر اجماع ہے کہ بوڑھا آدمی، جو روزہ رکھنے کی طاقت نہ رکھتا ہو، وہ روزہ نہ رکھے، بلکہ ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دے۔ دیکھیں (الاجماع لابن المنذر: ۱۲۹)

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ”وہ بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت جو روزہ رکھنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں، وہ ہر روزے کے بدلے میں ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔“ (صحیح بخاری: ۴۵۵)

نیز آپ رضی اللہ عنہما نے آیت کریمہ ﴿وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مَسْكِينٍ﴾ (البقرہ: ۱۸۴) پڑھی اور فرمایا: ”بوڑھا شخص جو روزہ رکھنے کی استطاعت و طاقت نہ رکھتا ہو، روزہ نہ رکھے، بلکہ روزانہ ایک مسکین کو آدھا صاع گندم دے دے۔“ (سنن الدارقطنی: ۲۰۷/۲، ح: ۲۳۶۱، وسندہ حسن)

ایک روایت میں ہے کہ آپ رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ”ایک مد (تقریباً آدھا کلو) دے گا۔“ (سنن الدارقطنی: ۲۰۴/۲، ح: ۲۳۴۹، وقال: اسناد صحیح، وهو كما قال)

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے بارے میں روایت ہے کہ جب وہ ایک سال روزہ رکھنے سے عاجز آ گئے تو آپ رضی اللہ عنہ نے ایک ٹب میں شریذ تیار کی، تیس مسکین کو خوب سیر کر کے کھلا دی۔

(سنن الدارقطنی: ۲۰۶/۲، ح: ۲۳۶۵، وسندہ صحیح)

حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت کا روزہ

اللہ رب العزت کا یہ احسانِ عظیم ہے کہ اس نے اپنے بندوں کے لیے آسان ترین دین کا انتخاب کیا ہے اور ان کو رخصتوں سے نوازا ہے، حاملہ عورت اور بچے کو دودھ پلانے والی عورت کو یہ رخصت عنایت فرمائی ہے کہ اگر وہ اپنی جسمانی کمزوری یا اپنے بچے کی کمزوری یا دودھ میں نقصان کا خدشہ محسوس کریں تو روزہ نہ رکھے، بلکہ ہر روزے کے بدلے میں ایک مسکین کو کھانا کھلا دے، اس پر قضاء بھی نہیں ہے، جیسا کہ سیدنا انس بن مالک الکلبی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

أُغَارَتْ عَلَيْنَا خَيْلُ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَتَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فوجدته يتغذى، فقال: ادن، فكل، فقلت: انني صائم، فقال: ادن أحدثك عن الصوم الصيام، ان الله تعالى وضع عن المسافر الصوم و شطر الصلاة، وعن الحامل أو المرضع الصوم أو الصيام، والله! لقد قالهما النبي صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كلتيهما أو أحدهما، فيا لهف نفسي! أن لا أكون طعمت من طعام النبي صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.

”ہم پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے گھوڑے چڑھ آئے تو میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ دو پہر کا کھانا کھا رہے تھے، آپ نے فرمایا، قریب ہوا اور کھا، میں نے عرض کی، میں روزے دار ہوں، فرمایا، قریب ہو جا کہ میں تجھے روزے یا روزوں کے بارے میں بتاؤں، یقیناً اللہ تعالیٰ نے مسافر کو روزہ اور آدھی نماز معاف کر دی ہے، نیز حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت کو بھی روزہ یا روزے معاف کر دیئے ہیں، اللہ کی قسم! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دونوں کلمات (روزہ یا روزے) کہے یا ان دونوں میں سے ایک کہا، افسوس کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کھانا نہ کھایا!“

(مسند ابی داؤد: ۲۴۰۸، سنن النسائی: ۲۲۷۹، سنن الترمذی: ۷۱۵، واللفظ له ۱۶۶۷، حسن)

اس حدیث کو امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے ”حسن“ اور امام ابن خزمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے ”صحیح“ کہا ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ایسی حاملہ عورت کے بارے میں پوچھا گیا جسے اپنے بچے کے نقصان کا خطرہ ہو، آپ نے فرمایا، وہ روزہ چھوڑ دے، اس کے بدلے میں ایک مسکین کو ایک ”مد“ (تقریباً

نصف کلوگرام) گندم دے دے۔ (السنن الکبریٰ للبیہقی: ۲۳۰/۴ وسندہ صحیح)

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ایک حاملہ عورت نے روزے کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا: **أفطري، وأطعمي عن كل يوم مسكيناً ولا تقضي.**

”تو روزہ چھوڑ دے اور ہر دن کے بدلے میں ایک مسکین کو کھانا کھلا دے، پھر قضائی نہ دے۔“

(سنن الدارقطنی: ۲۰۷/۸، ح: ۲۳۶۳ وسندہ صحیح)

نافع بیان کرتے ہیں کہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی ایک بیٹی ایک قریشی کے نکاح میں تھی، وہ حاملہ تھی، رمضان میں اس نے پیاس محسوس کی تو آپ نے اسے حکم دیا کہ روزہ چھوڑ دے، ہر روزے کے بدلے میں ایک مسکین کو کھانا کھلا دے۔ (سنن الدارقطنی: ۲۰۷/۸، ح: ۲۳۶۴ وسندہ صحیح)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرمان باری تعالیٰ ﴿وَعَلَى الَّذِينَ يَطْبِقُونَ هَذِهِ﴾ (البقرہ: ۱۸۴) کی تفسیر میں فرماتے ہیں: **أثبتت للحبلی والمرضع.** ”یہ آیت حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت کے لیے ثابت (غیر منسوخ) رکھی گئی ہے۔“ (سنن ابی داؤد: ۳۲۱۷ وسندہ صحیح)

عظیم تابعی سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ حاملہ اور بچے کو دودھ پلانے والی عورت جو اپنے بچے کے حوالے سے خائف ہو، کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہ دونوں روزہ نہ رکھیں، ہر روزے کے بدلے میں ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں، چھوڑے ہوئے روزے کی قضائی بھی ان دونوں پر نہیں ہے۔

(مصنف عبد الرزاق: ۲۱۶/۴، ح: ۷۵۵۵ وسندہ صحیح)

بعض اہل علم کا یہ کہنا کہ یہ دونوں روزے کی قضائی بھی دیں گی، بے دلیل ہونے کی وجہ سے ناقابل التفات ہے۔

الحاصل: حاملہ اور بچے کو دودھ پلانے والی عورت دونوں روزہ نہ رکھیں، ہر روزے کے بدلے میں ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں، ان پر کوئی قضائی نہیں۔



اعتذار

ماہنامہ السنۃ شمارہ نمبر ۱۵ صفحہ نمبر ۱۲ سطر نمبر ۳۲ میں کمپوزنگ کی غلطی سے ”شعیب بن سعید“ کے بجائے ”شعیب بن سعید“ لکھا گیا ہے، قارئین کرام تصحیح فرمائیں۔ شکریہ



میت کی طرف سے روزوں کی قضائی

اگر کسی نے روزوں کی نذر مانی ہو اور اس کو پورا کرنے سے پہلے فوت ہو جائے تو اس کی طرف سے یہ روزے اس کا ولی رکھے گا، جیسا کہ

① سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”من مات وعليه صيام، صام عنه وليه.“ ”جو آدمی فوت ہو جائے، اس حال میں کہ اس کے

ذمہ روزے ہوں تو اس کی طرف سے اس کا ولی روزے رکھے۔“ (صحیح بخاری: ۱۹۵۲، صحیح مسلم: ۱۱۴۷)

✽ عمرہ سے روایت ہے: ”أَنَّ أُمَّهَا مَاتَتْ وَعَلَيْهَا مِنْ رَمَضَانَ، فَقَالَتْ لِعَائِشَةَ: أَقْضِيهِ

عَنْهَا؟ قَالَتْ: لَا، بَلْ تَصَدَّقِي عَنْهَا وَكَانَ كُلُّ يَوْمٍ نِصْفَ صَاعٍ عَلَى كُلِّ مَسْكِينٍ.

”ان کی ماں فوت ہو گئی، اس پر رمضان کے روزے باقی تھے، اس نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا، کیا میں اپنی ماں کی طرف سے ان کی قضائی دوں؟ آپ رضی اللہ عنہا نے فرمایا، نہیں، بلکہ ہر روزے کے بدلے کسی مسکین پر ایک صاع گندم صدقہ کر۔“

(مشکل الآثار للطحاوی: ۱۴۲/۳، وسندہ صحیح، المحلی لابن حزم: ۴/۷، واللفظ له، وسندہ صحیح)

اس حدیث کا مفہوم راویہ حدیث سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے فرمان سے واضح ہو گیا کہ اس حدیث سے نذر کے روزے مراد ہیں، نہ کہ رمضان کے، راوی اپنی روایت کو بہتر جانتا ہے۔

امام ابوداؤد رحمہ اللہ اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

هذا في النذر، وهو قول أحمد بن حنبل. ”یہ (حدیث) نذر کے (روزوں کے) بارے میں

ہے، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔“ (سنن ابی داؤد، تحت حدیث: ۲۴۰۰)

حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا کے عموم کی تخصیص یہ حدیث بھی کر رہی ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے

روایت ہے:

جاء رجل الى النبي صَلَّى الله عليه وسلم، فقال: يا رسول الله! إن أُمِّي مَاتَتْ وَعَلَيْهَا صَوْمُ

شهر، أفأقضيه عنها؟ قال: نعم، فدين الله أحق أن يقضى.

”ایک شخص نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی، اے اللہ کے رسول! میری امی فوت ہو گئی ہیں، ان پر ایک مہینے کے روزے ہیں، کیا میں ان کی طرف سے قضائی دوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا، ہاں! اللہ تعالیٰ کا قرض ادائیگی کا زیادہ حق رکھتا ہے۔“ (صحیح بخاری: ۱۹۵۳، صحیح مسلم: ۱۱۴۸)

بخاری و مسلم میں یہ الفاظ بھی ہیں: وعليها صوم نذر. ”اس پر نذر کے روزے ہیں۔“
 سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: اَنَّ سَعْدَ بْنَ عِبَادَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ اسْتَفْتَى رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ: اِنَّ أُمِّي مَاتَتْ وَعَلَيْهَا نَذْرٌ، فَقَالَ: اقْضِهِ عَنْهَا.
 ”سیدنا سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے رسول کریم ﷺ سے فتویٰ طلب کیا کہ میری والدہ فوت ہو گئی ہیں، ان پر نذر کے روزے تھے، آپ نے فرمایا، ان کی طرف سے قضائی دے۔“

(صحیح بخاری: ۲۷۶۱، صحیح مسلم: ۱۱۳۸)

یہ حدیث نص ہے کہ میت کی طرف سے نذر کے روزے رکھے جائیں گے۔
 سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایسے انسان کے بارے میں پوچھا گیا جو فوت ہو گیا ہو اور اس پر نذر کے روزے تھے تو آپ نے فرمایا: يصام عنه النذر.

”اس کی طرف سے نذر کے روزے رکھے جائیں گے۔“ (مصنف ابن ابی شیبہ: ۶۵/۴، وسندہ صحیح)

فائدہ: اگر مرنے والے پر رمضان کے روزوں کی ادائیگی ہو تو اس کی طرف سے روزہ نہیں رکھا جائے گا، بلکہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس فرمان کے مطابق ہر روزے کے بدلے آدھا صاع یا ایک مد گندم ولی صدقہ کرے گا۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ بھی یہی فرماتے ہیں۔ (مسائل الامام احمد بروایۃ ابی داؤد: ص ۹۶)

امام بخاری رحمہ اللہ کا بھی یہی موقف ہے۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: لا یصلی أحد عن أحد ولا یصوم أحد عن أحد، ولكن یطعم عنه، فکان کلّ یوم مدّاً من حنطة.

”کوئی کسی کی طرف سے نہ نماز پڑھے اور نہ کوئی کسی کی طرف سے روزہ رکھے، بلکہ (روزے کے بدلے میں) ہر دن ایک مد گندم صدقہ کرے۔“ (السنن الکبریٰ للنسائی: ۲۹۱۸، وسندہ صحیح)

میت کی طرف سے نذر کے روزوں کے علاوہ ولی روزے نہیں رکھ سکتا، کیونکہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما اسی

بات کے قائل ہیں کہ میت کے طرف سے نذر کے روزے رکھے جائیں۔

الحاصل : میت پر نذر کے روزے ہوں تو اس کا ولی ان کی قضائی دے گا، اگر رمضان کے روزے ہوں تو ولی ہر روزے کے بدلے میں آدھا صاع یا ایک مد گندم کسی مسکین پر صدقہ کرے گا۔

مقلدین نبی اکرم ﷺ، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی مخالفت میں کہتے ہیں:
”ولی میت کی طرف سے نذر کے روزے نہیں رکھے گا۔“
ولا يصوم عنه الولي .

(الهداية مع الدراية ، كتاب الصوم : ۲۰۳/۸)

قارئین کرام! انصاف شرط ہے کہ آپ نبی کریم ﷺ کی حدیث کو لیں گے یا فقہ حنفی کو؟



السنة کے ساتھ تعاون کیجئے

قارئین کرام! آپ دینی رسائل و جرائد کی اہمیت سے بخوبی واقف ہیں، احقاقِ حق اور ابطالِ باطل میں ان کا کردار آپ پر مخفی نہیں، اسی ضرورت کے پیش نظر ماہنامہ **السنة** کا اجرا کیا گیا ہے، جو کہ اپنا ایک سال مکمل کرنے کو ہے، اسے علماء و عوام کی طرف سے یکساں پذیرائی ملی ہے، یہ معاشرے کی ایک بڑی دینی ضرورت کو پورا کرنے میں مدد و معاون ثابت ہو رہا ہے، اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہ ایک مستند رسالہ ہے، جو ہر قسم کی ضعیف روایات و اقوال سے پاک ہے، اس کی تیاری میں ہمیں ایک جامع لائبریری کی اشد ضرورت ہے، ایک ایک حوالہ کے لیے دور دراز کا سفر کرنا پڑتا ہے، اس کی باقاعدہ اور معیاری طباعت پر خطیر رقم صرف ہوتی ہے، اگر آپ ہمارے منہج سے متفق ہیں اور ہماری کوشش پر مطمئن ہیں تو ہم آپ کے تعاون کے یقیناً مستحق ہیں، یہ آپ کا اپنا رسالہ ہے، اس کے ساتھ مالی معاونت جہاد فی سبیل اللہ کے زمرے میں آتی ہے، لہذا آپ اپنی زکوٰۃ اور صدقات و خیرات کی صورت میں اس سے تعاون کریں۔

یقیناً آپ کا اللہ کی راہ میں خرچ کیا ہوا مال دنیا و آخرت میں کام آئے گا۔



کیا غسل حیض سے پہلے مجامعت جائز ہے؟

حیض سے پاک ہونے کے بعد غسل سے پہلے جماع درست نہیں۔

اللہ رب العزت کا فرمان ہے:

﴿وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ قُلْ هُوَ أَذَىٰ فَأَعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ وَلَا تَقْرَبُوهُنَّ حَتَّىٰ يَطْهُرْنَ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ﴾ (البقرہ: ۲۲۲)

”وہ آپ سے حیض کے بارے میں سوال کرتے ہیں، فرمادیجئے کہ وہ ناپاکی ہے، تم دورانِ حیض عورتوں سے علیحدہ رہو (جماع نہ کرو)، پاک ہونے تک (جماع کی نیت سے) ان کے قریب نہ جاؤ، جب وہ (نہا کر) اچھی طرح پاک ہو جائیں، تو حکمِ الہی کے مطابق ان کے پاس آؤ۔“

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

وقد اتفق العلماء على أَنَّ المرأة إذا انقطع حيضها لا تحل حتى تغتسل بالماء أو تتيمم إن تعذر ذلك عليها بشرطه ، ألاَّ أَنَّ أبا حنيفة رحمه الله

”علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ عورت خونِ حیض رکنے کے بعد اس وقت تک مرد کے لیے حلال نہیں ہوتی، جب تک پانی سے غسل نہ کر لے یا مجبوری کی صورت میں تیمم نہ کر لے، سوائے ابوحنیفہ کے (وہ غسل کو ضروری خیال نہیں کرتے)۔“ (تفسیر ابن کثیر: ۱/۳۵۰)

معلوم ہوا کہ اس آیت میں ﴿حَتَّىٰ يَطْهُرْنَ﴾ سے مراد ”خونِ حیض کا رکننا“ اور ﴿فَإِذَا تَطَهَّرْنَ﴾ سے مراد ”غسل کرنا“ ہے۔

جلیل القدر تابعی امام مکرمہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: إذا انقطع عنها الدم فلا يأتيها ، حتى تطهر ، فإذا طهرت فليأتها كما أمر الله . ”جب عورت کا خونِ حیض رک جائے تو بھی غسل کرنے تک اس کا خاوند (جماع کے لیے) اس کے پاس نہ آئے، جب وہ غسل کر چکے، تو حکمِ الہی کے مطابق اس سے صحبت کر لے۔“ (مصنف ابن ابی شیبہ: ۱/۹۶، ۹۷، وسندہ حسن)

عظیم تابعی مجاہد بن جبر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

لا یقربہا زو جہا حتی تغتسل . ”جب تک وہ (حائضہ) غسل نہ کرے، اس کا خاوند،

(جماع کی نیت سے) اس کے قریب نہ آئے۔“ (سنن دارمی: ۱۱۱۷، مصنف ابن ابی شیبہ: ۹۶/۱، وسندہ صحیح)

امام کھول تابعی فرماتے ہیں: لا یغشی الرجل المرأة اذا طهرت من الحيضة حتی تغتسل .

”عورت کے حیض سے پاک ہونے کے بعد غسل کرنے سے پہلے مرد جماع نہیں کر سکتا۔“

(مصنف ابن ابی شیبہ: ۹۶/۱، وسندہ صحیح)

امام عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ سے اس بارے میں پوچھا گیا، تو فرمایا:

لا، حتی تغتسل . ”نہیں! غسل سے پہلے (جماع درست نہیں)“ (سنن دارمی: ۱۱۲۷، وسندہ صحیح)

امام طحاوی حنفی رحمہ اللہ (م ۳۲۱ھ) لکھتے ہیں:

ولا نعلم فی هذا التأویل اختلافاً بین أهل العلم ، وانقطاع الدّم ليس بطهر في نفسه ، لأنّها وإن خرجت به من الحيض فإنّها غير مباح لزوجهما و غير مباح لها الصّلاة والطّواف بالبيت حتی تغتسل بالماء أو تیمّم بالصّعيد عند عدم الماء ...

”ہمارے علم کے مطابق اس تفسیر (تَطَهَّرْنَ سے مراد غسل کرنے) میں اہل علم کا کوئی اختلاف نہیں، خون کا زکنا بذات خود پاکی نہیں ہے، کیونکہ خون رکنے سے وہ حیض سے تو نکل گئی ہے، لیکن خاوند کے لیے اس سے جماع جائز نہیں، اسی طرح نماز اور بیت اللہ کا طواف بھی جائز نہیں، تا آنکہ پانی سے غسل نہ کر لے یا پانی نہ ملنے کی صورت میں تیمّم نہ کر لے۔“ (احکام القرآن للطحاوی: ۱/۱۲۷)

امام ابن المنذر رحمہ اللہ (م ۳۱۸ھ) رقمطراز ہیں:

والذی بہ أقول ما علیه جمل أهل العلم ، أن لا یطأ الرجل زوجته إذا طهرت من المحيض حتی تطهر بالماء ، واللّٰه أعلم . ”میرا وہی مذہب ہے، جو تمام اہل علم کا ہے کہ مرد اپنی بیوی سے اس وقت تک جماع نہیں کر سکتا، جب تک وہ پانی سے (غسل کر کے) طہارت حاصل نہ کر لے۔“

(الأوسط لابن المنذر: ۲/۲۱۵)

کسی صحابی یا تابعی سے اس کے خلاف کچھ ثابت نہیں۔

الحاصل: حیض سے پاک ہونے کے بعد غسل سے پہلے جماع درست نہیں۔

